مولانا آزاد کی اہم کتابیں

رسولِ رحمت - سیرتِ طیبہ پر مولانا آزاد مرحوم و مغفور کے مقالات بہ ترتیب مطالب مرتبہ غلام رسول مہر صفحات ۸۰۰ بڑا سائز -/95

اسلام کا نظریۂ جنگ	15/-
ام الکتاب تفسیر سورۂ فاتحہ	40/
انتخاب الہلال	35/
مسئلہ خلافت	25/-
نگارشات آزاد	25/
آزاد کی تقریریں	25/-
مضامین البلاغ	20/
طنزیات آزاد	15/
انسانیت موت کے دروازے پر	22/-
مسلمان عورت	20/-
توحید و شہادت	10/-
ہجر و وصال	12/-
صدائے حق	7/50
تبرکاتِ آزاد	30/-

عکسی

مضامین البلاغ

ابوالکلام آزاد

○

مرتبہ

محمود الحسن صدیقی

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۵۶۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۲-۱۱۰۰۰

اشاعت اوّل ۱۹۸۸ء

تعداد .... ایک ہزار

طابع .... محمد اقبال

قیمت .... ۱۶/- روپے

ادبی مقالات

۱۰۶

اعتقاد پبلشنگ ہاؤس

۱۵۶۱ گلی کوتانہ سوئیوالان دہلی ۲-۱۱۰۰۰

مضامین البلاغ

فہرست مضامین

عرضِ ناشر

بیسویں صدی کے شروع میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؔ کی ادارت میں
کلکتہ سے الہلال والبلاغ دو مشہور اخبار یکے بعد دیگرے نکلے۔ الہلال نے ہندوستانی
مسلمانوں کو اُن کے تمام سیاسی وغیر سیاسی مُعتقدات واعمال میں اتباعِ شریعت کی تلقین
کی اور سیاسی آزادی وحریت کو دین ومذہب کی روشنی میں پیش کیا اور چند ہی سال
میں اُس نے مسلمانوں کی سیاسی ومذہبی زندگی میں انقلاب کی ایک لہر دوڑا دی۔

الہلال کے بند ہونے کے کچھ دنوں بعد البلاغ نکلا۔ یہ رسالہ بھی اپنی سحر نگاری
اور انقلاب آفرینی میں الہلال سے کم نہ تھا۔ اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک
جملے اور ایک ایک سطر نے دلوں پر تیر ونشتر کا کام کیا اور قوم کے جسدِ بے جان میں
زندگی پیدا کی۔

وقت کے سیاسی ہنگاموں نے اگرچہ مولانا ابوالکلام کو ہم سے الگ کر دیا ہے

لیکن ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک جملہ آج بھی ہمارے دلوں کو محبوب ہے۔ ان کے بکھرے ہوئے نادر شہ پاروں کو ہم آپ کے سامنے کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔

یہ مجموعہ صرف البلاغ کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی اور حالات نے مساعدت کی تو الہلال کے مضامین بھی ہم آپ کی خدمت میں پیش کریں گے

گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

وثائق وحقائق

۱۰

الدّین والسیاست

الدین والسیاست

(۱)

دُنیوی حکومتوں نے اگرچہ سیاست کو ظُلم و جور، تمرد و طغیان، خود غرضی و ہوائے نفس، کذب و فریب، دسائس و جل، اور حرص و مطامع کا مرادف بنا دیا، لیکن درحقیقت وہ ایک روحانی صداقت ہے، جس پر دُنیا کی تمام صداقتوں کی طرح ابتلاء و امتحان، ترقی و تنزل اور ظہور و خفاء کے مختلف دَور گذر چکے ہیں آغازِ خلقت میں جب انسان جنگل کے تاریک گوشوں اور پہاڑوں کے اندھیرے غاروں میں رہتا تھا، تو سیاست بھی اس کے تمام محاسن و فضائل کی طرح انہی تاریکیوں میں عزلت گزیں رہی۔ پھر جب دُنیوی تمدن نے ترقی کی اور متمدن سلطنتیں قائم ہوئیں، تو سیاست نے بھی اس تاریک اُفق سے سر نکالا اور سلاطین کے ہوائے نفس کے ساتھ ساتھ مدتوں تک دُنیا پر جابرانہ حکومت کرتی رہی۔

لیکن اُس کا یہ جابرانہ دَورِ حکومت خُدا کی مرضی کے مطابق نہ تھا اس لیے وہ بادشاہوں کے عظیم الشان درباروں سے رُخصت ہوئی، اس نے تاج و تخت دھوکر لگائی، اور مذہب کے داعیانِ الٰہی کے دامن میں جاکر پناہ لی۔

دُنیا کی تمدنی تاریخ میں یہ ایک عظیم الشان انقلاب تھا، اس نے دُنیا کی غیر متحرک فضا میں شعاعِ آفتاب کی رعشہ دار انگلیوں کی طرح ایک نورانی تموج پیدا کر دیا، جس کی پہلی لہر دریائے نیل سے اُٹھی۔ اور پھر ریگستان عرب میں پہنچ کر آبِ زمزم کی سطحِ ساکن کے اندر مل گئی۔

القرآن الحکیم

قرآن حکیم ایک مجموعۂ صداقت ہے۔ اِس لیے اُس نے دُنیا کی تمام صداقتوں کے ساتھ سیاست کو بھی اپنے دامن میں سب سے پہلے جگہ دی اور جو نور چند لمحوں کے لیے کوہ طور پر چمکا تھا وہ ہمیشہ اس کے تاجِ حقیقت کا طرّۂ زرنگار رہا۔ سیاست الٰہی فرعون کے تاج و تخت کی ذمہ دار نہیں تھی، اس کا کام ابو جہل و ابو سفیان کی سیادت کو محفوظ رکھنا نہ تھا، وُہ دُنیا میں صرف میزانِ عدل کے قائم کرنے کے لئے آئی تھی، اِس لیئے اُس نے ایک فطری مذہب کی آغوش میں اپنے آپ کو نمایاں کیا، کیونکہ فطرت ہی ایک ایسی چیز ہے جو خود عدل و انصاف سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتی اور اگر وہ اپنے مرکز سے ہٹ جائے تو دُنیا کا تمام قدرتی نظام درہم برہم ہو جائے۔

المیزان

آفتاب و ماہتاب دُنیا پر ایک لازوال طاقت کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں، اور ان کا دورِ حکومت سلاطین کی حکومت سے بہت زیادہ وسیع و طویل ہے۔ گھنے درختوں کا سایہ، بادشاہوں کے دامن دولت سے بہت زیادہ فراخ ہوتا ہے۔ امیر و غریب کو یکساں طور پر جگہ دینے کے لیے اس کی آغوش ہر

وقت کھلی رہتی ہے۔ آسمان کی حکومت سب زیادہ قدیم اور پائدار ہے کہ وہ ازل ہی سے تمام دُنیا کے سر پر محیط ہے۔ لیکن فطرت نے اُن کو بھی خود سر، مغرور اور سرکش نہیں بنایا، بلکہ ایک عادلانہ نظام کا پابند کردیا ہے، اور انھوں نے فطرتِ الٰہی کے آگے اپنی اپنی گردنیں جھکا دی ہیں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ (۵۵:۴۰)

سورج اور چاند ایک خاص نظام کے ماتحت گردش کر رہے ہیں، درختوں نے بھی اپنے بلند سروں کو اسی نظام کے آگے جھکا دیا ہے۔ یہ فطری نظام قدیم سے ہے، خدا نے جب آسمان کو پیدا کیا اور اس کو بلند کیا تو اسی وقت ایک میزانِ عدل بھی قائم کردیا۔

اِنسان فطرت کا اعلیٰ ترین مظہر ہے، اس بناء پر خُدا کی ان عظیم الشان مخلوقات کی طرح وہ بھی اسی فطرتی نظام عدل کا پابند ہے اور اگر وُہ خدا کی تمام مخلوقات میں بڑا ہے تو اس کو خدا کے نظامِ عدل کا بھی سب سے زیادہ پابند ہونا چاہیے۔ چُنانچہ اللہ تعالیٰ نے آفتاب و ماہتاب کی پابندیوں کے جلوے دکھا کر انسان کو بھی اسی عادلانہ قانون کی پابندی کا حُکم دیا۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ الخ (۵۵:۸)

جس طرح آفتاب و ماہتاب، درخت اور آسمان، اپنے محورِ نظام عدل سے تجاوز نہیں کرتے، اسی طرح تم بھی اس میزانِ عدل کو پُوری عدالت کے ساتھ قائم رکھو، اور اس میں کسی قسم کی کمی بیشی نہ کرو۔

عدالتِ الٰہی

یہی نظام عدل ہے جو سیاست مذہبی کی روح ہے۔ مذہب دُنیا میں اسی کے پھیلانے کے لیے آیا تھا، لیکن انسان کا دست ستم ہمیشہ اِس نظام کو درہم برہم کرتا رہا ہے، اِس لیے فطرتِ الٰہی ہمیشہ اس کو سزا بھی دیتی رہتی ہے، اور سیاست کا میزان ہمیشہ قوت ہی سے قائم رہ سکتا ہے۔

فطرت کی عدالت دُنیوی عدالتوں سے بالکل مُختلف مگر اُن سے زیادہ مُنصف ہے۔ دنیوی عدالتیں سزائیں دیتی ہیں، لیکن جُرم و سزائیں کوئی مُناسبت نہیں ڈھونڈتیں اگر ایک شخص نے چوری کی ہے تو عدالت حکم دیتی ہے کہ وہ تین برس تک ایک عمارت کے اندر قید کر دیا جائے اگر ایک شخص نے مکر و فریب سے کسی کو دھوکا دیا ہے تو عدالت اُس کے اخلاقی مرض کا یہ علاج تجویز کرتی ہے کہ روز ایک من گیہوں پیسے۔ مگر فطرت جُرم و سزا میں ہمیشہ دقیق مناسبت تلاش کرتی ہے اور اُسی مناسبت کی بنا پر سزا دیتی ہے۔ مثلاً جن قوموں نے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی، میزانِ عدل و قسط کو پامال کیا، اور خدا کے بندوں پر ظلم و جبر کے ساتھ مُسلّط ہو گئے۔ تو خداوند تعالیٰ نے بھی اُن پر اپنی عظیم الشان مخلوقات کو مُسلّط کر دیا جنھوں نے ان کے سرِ غرور و طغیان کو چور چور، ریزہ ریزہ، پاش پاش کر دیا۔

كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ فَأَمَّا
ثَمُودُ فَأُهْلِكُوا بِالطَّاغِيَةِ وَأَمَّا عَادٌ
فَأُهْلِكُوا بِرِيحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ سَخَّرَهَا
عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَثَمَانِيَةَ أَيَّامٍ

ثمود و عاد نے ہلا دینے والی چیز یعنی قیامت کا انکار کیا جو
خدا کی عدالت کا دن تھا۔ پس ہم نے دُنیا ہی میں
اس کا نمونہ دکھا دیا۔ ثمود کی قوم زلزلے سے تباہ کر دی گئی
اور عاد پر آندھی کا طوفان آیا جو مسلسل سات رات اور

حُسُومًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيهَا صَرْعَى كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ فَهَلْ تَرَى لَهُم مِّن بَاقِيَةٍ (۶۹:۵)

آٹھ دن تک قائم رہا۔ لوگ اس میں گرے ہوئے کھوکھلے درختوں کی طرح نظر آتے تھے۔ وہ کہ اپنی آبادیوں اور عمارتوں پر ناز کیا کرتے تھے اور ظلم و فساد کے غرور میں عذاب الٰہی سے غافل تھے۔ آج زمین پر ان کی ایک یادگار بھی نہیں دکھائی جا سکتی

ایک مدت تک اسی نظام عدل اور اصول فطرت کی بنا پر دنیا میں قومیں بنتی بگڑتی رہیں۔ جب تک دُنیا میں کوئی قوم یا کوئی سلطنت عدل و انصاف کے قیام کے ذریعے خود صالح رہی، اور اپنے ساتھ دُوسروں کی بھی اصلاح کی، اس وقت تک وہ ہلاکت و بربادی سے محفوظ رہی۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَىٰ بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (۶۹:۵)

تمہارا پروردگار کسی آبادی کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک وہ اصلاح کی خدمت انجام دیتی ہے۔

دنیا کی بادشاہت و سیاست صرف اصلاح کے لیے ہے۔ "اصلاح" اور "فساد" کی تشریح کا یہ موقع نہیں لیکن تم سورۂ انبیاء میں بار بار پڑھ چکے ہو۔

إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ (۲۱:۱۰۵)

زمین کے وارث صرف ہمارے صالح بندے ہوئے اور رہیں گے۔

لیکن برخلاف اس کے جب کسی قوم نے عدل کو ظلم سے اور اصلاح کو فساد سے بدل دیا، اور خدا کے بندوں کو خدا کی غلامی سے ہٹا کر اپنا غلام بنانا چاہا تو وہ دفعۃً ہلاک کر دی گئی۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ تمہارے پروردگار نے عاد ارم

اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ وَ ثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ وَ فِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ الَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ فَاَکْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ فَصَبَّ عَلَیْهِمْ رَبُّکَ سَوْطَ عَذَابٍ (۸۹ : ۵)	کے ساتھ کیا سلوک کیا جو ایسے قوی و تمدن تھے کہ دُنیا میں ویسی قوم اب تک پیدا نہیں ہوئی؟ اور قوم ثمود جنھوں نے اپنے رہنے کے لیے پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے تھے اور فرعون جو اپنی شان و شوکت کے لیے خیمہ و خرگاہ رکھتا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے انسانی آبادیوں میں فتنہ و ظلم کا بڑا سر اُٹھایا تھا اور عدل و اصلاح کی جگہ اُن میں فساد پھیلا رکھا تھا پس قانون الٰہی نے اپنے تازیانۂ عذاب کو حرکت دی اور ان سب کو نابود کر دیا۔

ان آیات کریمہ نے ظلم و عدوان اور تمرد و طغیان ہی کی تصریح نہیں کی بلکہ اس کے سرچشمۂ اصلی کی طرف اشارہ بھی کر دیا، یعنی قوت کا صحیح استعمال جس طرح دنیائے نظام عدل و معیار انصاف کو قائم رکھ سکتا ہے، اسی طرح اس کا غلط استعمال اِس شیرازہ کو درہم برہم بھی کر دیتا ہے۔

عذاب الٰہی کا پہلا دور

لیکن ہوائے نفسانی قوت کا مرکز ثقل اکثر بدل دیتی ہے، اور جب تک کوئی روحانی طاقت ان اغراضِ فاسدہ کی مقاومت نہیں کرتی، قوت ہمیشہ بے راہ روی اختیار کرتی رہتی ہے۔ ان قوموں نے دُنیا میں ظلم و عدوان کی جو آگ بھڑکا دی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے ضمیر کا احساس بالکل فنا ہو گیا تھا۔ یہ وسیع ملک رکھتے تھے، دولت و ثروت کا ذخیرہ اُن کے پاس تھا، اور قوتِ جسمانی نے پہلوؤں

کو اُن کے لیے روئی کا تودہ بنا دیا تھا۔ خدا کی زمین صالح تھی، اس نے نیکی کے بیج کے لیے اپنی آغوش کو کھول دیا تھا، اور عدل و انصاف کا چشمہ اس کے ایک ایک مسام سے اُبل سکتا تھا۔ اگر یہ قومیں زمین کی اصلاح پر آمادہ ہوتیں تو وہ بھی اُن کو صالح قوم کا خطاب دیتی، اور اپنے آپ کو ہمیشہ کے لیے اُن کے قدموں کے نیچے ڈال دیتی لیکن انہوں نے زمین کو اپنی راہوار فاسدہ کا مُرغزار بنایا اور اس میں گُل و ریحاں کے بجائے کانٹے بوئے، اس لیے جو چیزیں نیکی کے بیج کی تربیت و نشوونما کر سکتی تھیں، وہی اُن کے لیے عذابِ الٰہی بن گئیں۔ ثمود کو خود زمین ہی نے پیس دیا، عاد کی نسل کو خود ہوا ہی اڑا لے گئی، اور فرعون کو خود دریائے احمر کی موجیں نگل گئیں۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے قرآن حکیم دُوسری آیتوں میں اس اصول کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَ اٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ الخ (۷۹:۳۷)

لیکن جو شخص سرکش ہو، اور دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دے تو اُس کا ٹھکانا صرف جہنم ہے، لیکن جو شخص خدا سے ڈرا اور اپنے دل کو اُن نفسانی خواہشوں سے روکا جو ظلم و تمرد اور طغیان و فساد کی طرف لے جاتی ہیں تو اُس کا ٹھکانا جنت ہے۔

عذابِ الٰہی کا دُوسرا دَور

لیکن دُنیا کی ترقی کے ساتھ قوانین فطرت نے بھی ترقی کی ہے اور اس ترقی کی حرکت نہایت عجیب و غریب ہے۔ دُنیا کی ہر چیز ترقی کرتی ہے تو بڑھتی ہے، اُبھرتی ہے، پھیلتی ہے لیکن قوانین فطرت کی نشوونما بالکل اس کے برعکس ہوئی۔ انہوں

نے ترقی کی تو سُکڑنا شروع کیا۔ اور سمٹ کر انسان کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ پہلے خاک کے ذرات میں ملے ہوئے تھے، ہوا کے اجزاء میں بکھرے ہوئے تھے پانی کی موجوں کے ساتھ تیرتے پھرتے تھے۔ جب کوئی قوم نظام عمل کی خلاف ورزی کرتی تھی، تو خاک کے تودوں، ہوا کے جھونکوں اور دریا کی لہروں کے اندر ہیجان پیدا ہوتا تھا۔ اور وہ زمین کی زلزلہ انگیز حرکت، ہوا کے قیامت خیز تموج اور سمندر کی طوفانی لہروں کی صورت میں نمود کر کے بستیں ڈالتے تھے، اُڑا لے جاتے تھے بہا کر ساحل تک پہنچا دیتے تھے۔ لیکن اب انھوں نے انسان ہی کے دل و دماغ کو اپنا نشیمن بنایا کہ وہ تمام مظاہر فطرت کا مجموعہ تھا پس اب اور تمام ذمہ داریوں اور ان تمام فرائض کا بوجھ صرف انسان ہی کے سر پر آگیا، جس کو آسمان اور زمین نے گھبرا کر اپنے کندھے سے پھینک دیا تھا:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا الخ (۷۲:۳۳)

ہم نے اپنی امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا، لیکن سب نے اس کے اُٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے۔ اور انسان آگے بڑھا اور اس بوجھ کو اُٹھا لیا۔ بلاشبہ ایسا کر کے اُس نے اپنے اُوپر ظلم کیا اور بڑی ہی نادانستگی کی۔

انبیاء کرام کا ظہور اسی ترقی کی مکمل صورت تھی لیکن آغازِ فطرت سے انسانی قوت نے جو بے راہ روی اختیار کی تھی، اب وہ اپنے انتہائی درجے تک پہنچ چکی تھی اور انبیاء علیہم السلام نے زبانی وعظ و نصائح اور ہدایت و ارشاد کا جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا، وہ دُنیا کے لیے کافی نہ تھا۔ اب دُنیا کے نقشے میں

بالکل چُور چُور ہو گئی، اور ایسی حالت میں اس کا مقابلہ صرف قوت ہی سے کیا جا سکتا تھا۔ انسان پر فطرت نے جو ذمہ داریاں عائد کر دی تھیں، تمدن کی ترقی اور جذبات و عواطف کی رقت و لطافت نے ان کے احساس کو اور بھی سریع الاشتعال بنا دیا تھا، اس لیے قلب کی یہ حرکت ہاتھ پاؤں میں جُنبش پیدا کرنا چاہتی تھی، اور انسان زبان کے ساتھ ہاتھ سے بھی کام لینا چاہتا تھا۔

دعوت موسوی

اس آتش کدہ کی آگ سب سے پہلے مصر کی سرزمین میں بھڑکی، جس کو فراعنہ نے ظلم و عدوان اور تمرد و طغیان کا جولان گاہ بنا دیا تھا، جہاں ایک قوم کے ساتھ اسیر و غلامی کی حالت میں جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا تھا۔

غلامی کی لعنت کی زنجیریں اس کے پاؤں میں تھیں، اور انسانی حکومت کی پرستش کا داغ پیشانی پر۔ ظالمانہ طرزِ عمل صرف فرعون کے قصر شاہی تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ اس کا نظارہ ہر گلی کوچے میں نظر آتا تھا۔ حاکم قوم اپنی قومی حکومت کے گھمنڈ میں بنی اسرائیل کے ہر فرد کو اپنا زر خرید غلام سمجھتی تھی، اور اس کو یقین تھا کہ سرزمین کنعان کا یہ مہجور گلہ صرف اسی لئے ہمیں دیا گیا ہے تاکہ چارپایوں کی طرح ہمارے آگے جھکے، اور کُتّے کی طرح ہماری جُوتیوں کی گرد چاٹے۔ پس خدائے تعالیٰ کے ایک اولوالعزم، صاحب قوت و نفوذ اور ذکی الحس بندے نے راہِ جور و ستم کا یہ درد انگیز نظارہ دیکھا، اور ایک مظلوم اسرائیلی شخص کی اچانک فریاد، اور غیرت قومی کے فوری احساس نے اس کے جذبات رقیقہ کے برقی خزانے میں آگ لگا دی۔

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ الخ

اور ایک ایسی حالت میں جبکہ تمام شہر غافل تھا موسیٰ شہر میں آئے اور دو آدمیوں کو دیکھا کہ لڑ رہے ہیں، اُن میں ایک موسیٰ کی قوم کا تھا، دُوسرا اس کے دُشمن کے گروہ کا۔ موسیٰ کو دیکھ کر اس کی قوم کے آدمی نے اپنے دشمن کے مقابلے میں مدد مانگی، موسیٰ نے اس کی مدد کی۔ اس کے دُشمن کو ایک گھونسا ملا اور وہ مر گیا موسیٰ نے دل میں کہا کہ یہ تو ایک شیطانی کام ہو گیا، بیشک شیطان انسان کا دشمن اور گمراہ کن ہے۔

اس کے بعد اگرچہ فرعون کے غلبہ اور جبر و استبداد کے خوف سے موسیٰ علیہ السلام گھبرا گئے، لیکن قومی حمیت کی آگ برابر سلگتی رہی سوءِ اتفاق سے دُوسرے دن پھر یہی ناگوار موقع پیش آگیا۔

فَاَصْبَحَ فِى الْمَدِيْنَةِ خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ فَاِذَا الَّذِى اسْتَنْصَرَهٗ بِالْاَمْسِ يَسْتَصْرِخُهٗ قَالَ لَهٗ مُوْسٰٓى اِنَّكَ لَغَوِىٌّ مُّبِيْنٌ فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ بِالَّذِىْ هُوَ عَدُوٌّ لَّهُمَا قَالَ يٰمُوْسٰٓى اَتُرِيْدُ اَنْ تَقْتُلَنِىْ كَمَا قَتَلْتَ نَفْسًا بِالْاَمْسِ اِنْ تُرِيْدُ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ جَبَّارًا فِى الْاَرْضِ الخ (۲۸ : ۱۷)

اب موسیٰؑ شہر میں خوف زدہ ہو کر چھپنے لگے، اتفاق سے پھر وہی پہلا سا موقع پیش آگیا۔ اور جس شخص نے کل اُن سے مدد طلب کی تھی اُس نے آج پھر اُن سے فریاد کی۔ موسیٰؑ نے کہا تو بڑا گمراہ آدمی ہے۔ پھر جب موسیٰؑ نے اس قبطی پر حملہ کرنا چاہا جو ان دونوں کا دشمن تھا، تو اس نے کہا: کیوں موسیٰ! جس طرح تم نے کل ایک آدمی کو مار ڈالا ہے، کیا آج اسی طرح مجھے بھی قتل کرنا چاہتے ہو؟ تم زمین میں ظالم بن کر رہنا چاہتے ہو اور دوست بننا تمہیں پسند نہیں؟

ہجرت

اب تمام شہر میں اس واقعے کی شہرت ہوگئی اور حضرت موسٰی علیہ السلام کے سامنے جلا وطنی کا وہ مقدس مرحلہ پیش آگیا، جو ہر حقانی جدوجہد کی پہلی منزل ہے :-

وَجَآءَ رَجُلٌ مِّنْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ يَسْعٰى قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّىْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا الخ (۱۹ : ۲۲)

شہر کے کنارے سے ایک آدمی دوڑتا ہوا آیا اور کہا کہ اے موسٰی! ارکان سلطنت تمہارے قتل کے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں۔ اب تم یہاں سے نکل جاؤ، میں تمہیں خیر خواہانہ مشورہ دیتا ہوں۔ موسٰی شہر سے خوف زدہ ہو کر خفیہ طور پر نکلے اور خدا کی جناب میں دعا مانگی کہ بار خدا وندا! مجھ کو ظالموں کے پنجے سے نجات دے!

حُریت کا بیرونی مرکز

مصر سے نکل کر ان کو خدا کے اس صالح بندے کی باریابی کا شرف حاصل ہوا جو مصر کی غلامانہ اور مستبدانہ آبادی کی جگہ آزادی کی آب و ہوا میں آزادانہ زندگی بسر کر رہا تھا، اور حضرت موسٰی کی دعوت حُریت کے لیے یہ دوسری منزل تھی کہ ایک آزاد و خود مختار سرزمین میں رہ کر آنے والے وقت کے لیے تیار ہوں:

فَلَمَّا جَآءَهٗ وَقَصَّ عَلَيْهِ الْقَصَصَ قَالَ لَا تَخَفْ نَجَوْتَ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ○

جب حضرت موسٰی علیہ السلام حضرت شعیبؑ کے پاس مدین میں آئے اور ان سے اپنے واقعات بیان کئے، تو انھوں نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا مت ڈرو، تم نے ظالم قوم کے پنجے سے نجات حاصل کر لی۔

تکمیل و اعلان

مذہبی حیثیت سے یہ پہلا قدم تھا جو سیاست کی طرف بڑھایا گیا تھا۔ لیکن قومی

حمیت کی جو آگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں سلگ رہی تھی، اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حرارت درکار تھی۔ چنانچہ جب فرعون کے تخت و تاج کے اُلٹنے کا وقت آ گیا تو آتش کدۂ طور نے اپنی حرارت کو اُن کے مقدس دل کے اندر مشتعل کر دیا۔

فَلَمَّا قَضٰى مُوْسَى الْاَجَلَ وَسَارَ بِاَهْلِهٖٓ اٰنَسَ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ نَارًا ۚ قَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِخَبَرٍ اَوْ جَذْوَةٍ مِّنَ النَّارِ لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ (۲۸ : ۲۹)

جب موسیٰؑ نے شعیبؑ کی خدمت میں اپنے درس ذکر کے دن پورے کر لئے اور اپنے اہل و عیال کو لے کر وہاں سے چلے اور طور کے دامن میں ایک آگ نظر آگئی۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: تم لوگ ٹھیرو، میں اُس آگ کا پتہ لگاؤں یا آگ کا کوئی انگار ساتھ لے آؤں تاکہ تمہارے تاپنے کے کام آئے لیکن جب وہ اس آگ کے پاس پہنچے تو وادی ایمن کے کنارے سے ایک ربانی صدا اُٹھی : اے موسیٰ یہ آگ نہیں ہے جس کے لئے تم دوڑے ہو، بلکہ میں ہوں تمام دُنیا کا پالنے والا!

خدا تعالیٰ کو دُنیا کے ایک سب سے بڑے سرکش اور مستبد بادشاہ، اور سب سے بڑی ظالم حکمران قوم کو ہلاک کرنا منظور تھا، اس لیے وہ خود ہی دُنیا میں اُتر آیا جیساکہ وہ ہمیشہ اپنی جلال و قہاریت کی فضا میں اُترتا رہا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وجود مطہر کے اندر سے اُس نے اپنی پاک حریت اور انسانیہ کی قدرتی آزادی کے ظہور کا اعلان کر دیا۔ لیکن ابھی حضرت موسیٰؑ اس راہ کے پہلے مرحلے میں تھے، اور اقتضائے بشریت سے اُن کے دل میں خوف و ہراس باقی تھا۔ وہ جب اپنی تنہائی اور فرعونیوں کی کثرت و قوت کا مقابلہ کرتے تھے تو قدرتی طور پر اُن کے اندر ہراس پیدا ہو جاتا تھا پس

قوت مرتبہ الٰہی نے سب سے پہلے اُن کے قلب کو مختلف طریقوں سے عزم و ثبات کا کامل جوہر بخشا اور دکھلا دیا کہ طاقت صرف انسانوں کی قلت و کثرت ہی میں مخفی نہیں ہے، حق اور ربانی نصرت کی رُوح سے معمور ہو کر ایک تنہا انسان لاکھوں پر غالب آسکتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے اُسے حکم دیا:

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ۔ (۲۸ : ۳۱)

اے موسیٰ اپنی لاٹھی پھینک دو۔ جب موسیٰ نے اپنی لاٹھی کو دیکھا تو وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہی تھی وہ ڈرے اور پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ خدا نے کہا: اے موسیٰ ہم پیچھے ہٹنے کے لیے پیدا نہیں کئے گئے ہو۔ تمہارا کام صرف آگے بڑھنا ہے۔ آگے بڑھو، کیونکہ تمہیں آگے ہی بڑھانے کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے، خوف نہ کرو، تم ہمیشہ امن میں رہو گے۔

موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ نے اب تک اگرچہ تلوار کا قبضہ نہیں پکڑا تھا، لیکن خدا نے اُن کو دکھا دیا کہ جو ہاتھ حق کی حمایت میں اُٹھتا ہے، اُس کے پاس گو لوہے کی تلوار نہ ہو لیکن وہ خود اپنی اُنگلیوں کے اندر ہی تلوار کی چمک رکھتا ہے:

اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ۔ (۲۸ : ۳۲)

اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالو، وہ اس کے اندر سے چمکتا ہوا نکلے گا۔ اور اس سے تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچے گا۔ اپنے بازو کو سمیٹ لو، تمہارے خدا کی طرف سے فرعون اور اُس کی قوم کے لیے یہ دو نشانیاں ہیں، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے عدالتِ الٰہی کے قانون کو توڑ دیا تھا اور

اللہ کی اطاعت سے باہر ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اب اگرچہ ان معجزانہ آلات حرب سے مسلح ہو گئے، لیکن سیاسی میدان میں تلوار کی چمک اور توپوں کی گرج سے زیادہ دل کی قوت اور زبان کی طاقت و روانی کام آتی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی کمزوریوں کا عذر کیا،

قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ نَفْسًا فَأَخَافُ الٰہی! ان کی قوم کے ایک آدمی کو میں نے مار ڈالا ہے۔

أَن يَقْتُلُونِ وَأَخِي هَارُونُ هُوَ أَفْصَحُ مِنِّي لِسَانًا فَأَرْسِلْهُ مَعِيَ رِدْءًا يُصَدِّقُنِي إِنِّي أَخَافُ أَن يُكَذِّبُونِ (۲۸ : ۳۴)

ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے عوض مجھے قتل کر دیں میرا بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصیح و مقرر ہے، اس کو میرا حامی بنا کر میرے ساتھ کر دے کہ وہ میری تصدیق کرے، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ مجھے جھٹلائیں۔

خدا نے اُن کی تمام دُعائیں قبول کیں اور حضرت ہارون علیہ السلام کی مدد سے اُن کے دست و بازو کو قوی تر کر دیا،

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِأَخِيكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُونَ إِلَيْكُمَا بِآيَاتِنَا أَنتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغَالِبُونَ (۲۸ : ۳۵)

خدا نے کہا: ہم تیرے بھائی کے ذریعے تیرے دست و بازو کو قوی کر دیں گے اور تم دونوں کو اپنے معجزات قاہرہ کی برکت سے ایسا غلبہ عطا کریں گے کہ وہ لوگ تمہارے پاس پھٹک بھی نہ سکیں گے۔ صرف تم اور تمہارے ساتھیوں ہی کو غلبہ حاصل ہوگا۔

حضرت موسیٰ کا مطالبہ

خدا تعالیٰ نے ان معجزات قاہرہ اور ان بشارت عظیمہ کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیجا فرعون مشرک بھی تھا، مے نوش بھی تھا،

بدکار بھی تھا، فاسق بھی تھا، فاجر بھی تھا، غرض وہ سب کچھ تھا جو دُنیا کا ایک سیاہ کار اور شریر و ظالم انسان ہو سکتا ہے۔

لیکن اب غور کرو کہ تفسیرِ قرآن کا کیسا اہم مقام تمہارے سامنے ہے اور افسوس کہ تم نے قرآن کا حق فہم کبھی بھی ادا نہ کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک پیغمبر حق تھے۔ توحیدِ الٰہی، ردِّ شرک و اصنام پرستی، تزکیۂ نفس و اخلاق، درسِ کتاب و حکمت، اُن کے فرائضِ نبوت کے حقیقی ارکان ہیں۔ ان کا مخاطب ایک مُشرک و فاجر پادشاہ اور ایک مُشرک و فاجر حکمراں قوم تھی۔ اگر "سیاست" اور "دین" دو الگ الگ چیزیں ہیں جیسا کہ نادانی اور جہل کے ابلیس نے تمہیں سمجھایا ہے، اور اگر ایک قوم کو غلامی سے نجات دلانا ایک غیر دینی عمل ہے جیساکہ بدبختانہ تم سمجھتے آئے ہو، تو اب ضرور تھا کہ حضرت موسیٰؑ کی دعوت و تبلیغ بھی اِس چیز سے بالکل الگ رہتی جس کا نام تم نے "سیاست" رکھا ہے۔ وُہ آتے اور فرعون سے سب کچھ چاہتے، مگر وہ نہ چاہتے جو نہ تو دین ہے اور نہ پیغمبرانہ دعوت کا کوئی جزء حقیقی، مگر قرآن حکیم تمہارے سامنے موجود ہے۔ خدا نے فرعون کو نہ تو توحید کی دعوت دی، نہ اُس کی شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں، نہ اُس کی سیہ کاریوں کا جائزہ لیا بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس دعوت کا صرف ایک ہی مقصد بتاکر رخصت کیا:

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى — فرعون کے پاس جاؤ کیوں کہ وہ بڑا سرکش اور ظالم ہو گیا ہے۔ (۲۰:۲۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام اُس کے پاس آئے اور انھوں نے بجز اس کے اور کچھ نہ کہا کہ،

اَنْ اَدُّوْا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۴۴ : ۱۷)

خدا کے بندوں یعنی قوم بنی اسرائیل کو مجھے واپس دے دو جسے تم نے اپنا محکوم بنا رکھا ہے ۔ میں تمہارے پاس ایک امانت دار رسول بن کر آیا ہوں ۔

تم نے غور کیا یعنی حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے آگے اپنی تبلیغ کا مقصد یہ نہیں کہا کہ فسق و فجور چھوڑ دو، گناہ اور شرارت سے باز آجاؤ، نیک زندگی اختیار کرو، پاک طریقوں پر عمل کرو، بلکہ اوّلین مطالبہ یہ کیا کہ خدا کے جن بندوں کے پاؤں میں تُو نے اپنی محکومی اور غلامی کی زنجیریں ڈال دی ہیں انہیں چھوڑ دے اور مجھے واپس دے دے ۔ خدا نے مجھے اِس قوم کا امین بنایا ہے ۔ اس کے بندوں کو مَیں آزادی دلاؤں گا ۔ محکومی کی جگہ ایک حکمران قوم بناؤں گا ۔ خدا کے بندے خدا کی امانت ہیں ۔ تو ظالم و مستبد ہے، اِس لیے تو اس امانت کا مستحق نہیں ۔ یہ شرف اللہ نے مجھے عطا فرمایا ہے کہ مَیں اس امانت کو ٹھیک ٹھیک اپنے پاس رکھوں گا!

یہ مطالبہ اگرچہ نہایت مختصر الفاظ میں کیا گیا، لیکن درحقیقت وہ سیاست کی روح سیاست کا مغز اور سیاست کی حقیقی تفسیر تھا ۔ پہلے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا مطالبہ "ادوا" کے لفظ سے کیا ۔ "ادوا" کا اصل "الاداۃ" ہے اور اس کے معنی ہیں "دفع الحق" کے، یعنی کسی ایسی چیز کو دے دینا جو لینے والے کا حق تھا، تم نے اسے اپنے پاس سے نہیں دیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اداء خراج، اداء جزیہ، اداء امانت، عربی میں بکثرت آتا ہے ۔ خراج اور جزیہ حکومت کا حق ہے ۔ امانت، امانت رکھنے والے کی چیز ہے ۔ اسے واپس دینا، اس کے حق کو ادا کرنا ہے ۔ پس حضرت موسیٰؑ نے "ادوا" فرمایا یعنی ایک ایسی چیز مانگی جو فرعون کی ملکیت نہ تھی، حضرت موسیٰؑ کا حق تھا ۔ اس سے ثابت

ہوتا ہے کہ رعایا کسی قوم کے ظلم وستم کا تختۂ مشق نہیں بنائی گئی ہے۔ اگر خدا نے کسی گروہ کو کسی شخص کے ہاتھ میں دے دیا ہے تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وُہ اِس سے آلہ بے جان کی طرح کام لے اور اپنا غلام بنالے۔ اگر ایک قوم کسی ضعیف فرقے کی قسمت کی مالک ہو گئی ہے تو وہ اس کو اپنے اغراض ذاتی و قومی کا ذریعہ نہیں بنا سکتی۔ رعایا ایک امانتِ الٰہی ہے اور جب کوئی قوم اس امانت میں خیانت کرتی ہے تو خدا اُس کو واپس لے کر اپنے دُوسرے امانت دار بندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

پھر انہوں نے بنی اسرائیل کو "عباد اللہ" کے لفظ سے تعبیر کیا۔ جس میں یہ اشارہ تھا کہ رعایا بادشاہوں کی محکوم ہو کر اُن کی غلام نہیں بن جاتی۔ بلکہ اُس کے گلے میں غلامی کا صرف ایک ہی حلقہ ڈالا گیا ہے، اور وُہ حلقہ صرف خدا کی عبودیت کا ہے۔ وہ "عباد اللہ" ہیں "عباد السلاطین" نہیں ہیں۔ ان کو خدا کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، انسانوں کے تختِ غرور کے آگے جھکنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔ پھر انہوں نے اپنا تعارف "رسول امین" کے لقب سے کرایا۔ جس سے وہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ فرعون نے امانتِ الٰہی میں خیانت کی، اِس لیئے خدا اب اپنی امانت کو ایک دوسرے بندے کے سپرد کرنا چاہتا ہے۔

خدا نے اپنے صالح بندوں کو جہاں کہیں تاج و تخت کی بشارت عظیمہ دی ہے، اِس سے حکومت کرنے کی صلاحیت ہی مراد ہے اور دنیا کی جس سلطنت نے سیاست کے اِس اصول زریں کو پامال کر دیا، وہ دفعتہً برباد ہو گئی۔ دُنیا کے جبابرہ میں فرعون نے سب سے زیادہ بیدردی کے ساتھ اِس اصول کو پامال کیا تھا وہ بنو اسرائیل کو نہ صرف غلام بلکہ اپنی جائدادِ غیر منقولہ سمجھتا تھا، اور ان کے واپس کرنے پر کسی طرح

راضی نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے حضرت موسیٰ نے جبراً ان کو چھین لینا چاہا کہ جبر کا علاج صرف جبر ہی سے ہو سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے حکم دیا۔

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ (۴۴: ۲۲) میرے بندوں کو راتوں رات لے کر نکل جاؤ، تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

عذابِ الٰہی کا ظہور

حضرت موسیٰ علیہ السلام اس امانتِ الٰہی کو لے کر نکلے تو حسب الاطلاع فرعون نے ایک عظیم الشان لشکر کے ساتھ ان کا تعاقب کیا۔ اب اگرچہ اس قسم کے سرکشوں کی سزا کے لیے خدا نے خود انسان ہی کو مسلط کر دیا تھا، اور دوسری فطری مخلوقات نے اپنا یہ منصب انسان ہی کو دے دیا تھا۔ تاہم فرعون کی ہلاکت و بربادی میں سب نے کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ دریائے احمر کی موجیں ان کو نگل گئیں خوش فضا باغوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا، زمین سے ابلنے والے چشمے ان سے علیحدہ ہو گئے، لہلہاتی ہوئی کھیتیاں اُن سے روٹھ گئیں اور آسمان و زمین تک کو اُن پر رحم نہ آیا۔

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا إِنَّهُمْ جُندٌ مُّغْرَقُونَ، كَمْ تَرَكُوا مِن جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ وَزُرُوعٍ وَمَقَامٍ كَرِيمٍ وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ كَذَٰلِكَ وَأَوْرَثْنَاهَا قَوْمًا آخَرِينَ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ (۴۴: ۲۳)

ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ دریا کو ساکن چھوڑ دو اور نکل بھاگو۔ فرعون اپنے لشکر سمیت اس میں ڈوب جائے گا، چنانچہ حکم الٰہی پورا ہوا، اور وہ سب کے سب دریا کی لہروں میں نابود ہو گئے۔ پھر دیکھو کہ یہ کون لوگ تھے؟ اُن کی کیسی شان و شوکت تھی؟ کیسا جاہ و جلال تھا؟ کیسا گھمنڈ اور کیسی شرارتوں سے بھری ہوئی صدائیں نہیں؟ لیکن بالآخر خدا کے عذاب سے کوئی طاقت اُنھیں نہ بچا سکی۔

کس قدر سرسبز باغ، کیسی کیسی دلفریب نہریں، شاداب و پُر ثمر زراعت گاہیں عالیشان و پُر تکلف عمارتیں، عیش و نشاط کی نعمتیں، غرض کہ وہ سب کچھ جو دنیوی جاہ و جلال میں سے اُن کے پاس تھا اور جن کے اندر وہ بے فکری کے مزے اڑا رہے تھے اپنے بعد چھوڑ گئے اور ہم نے دوسری قوموں کو ان کا وارث بنایا جو ان پر قابض ہوگئیں، اور باوجود اس دردانگیز انقلاب کے نہ تو آسمان ہی ان پر رو دیا اور نہ زمین ہی نے آنسو بہائے اور نہ ان کو اپنی حالت کی اصلاح کی مہلت دی گئی۔ کیونکہ مہلت پوری ہو گئی تھی، اور آسمان و زمین کا خداوند جب ناراض ہو جائے تو پھر تمام کائناتِ ہستی میں کون ہے جو ان بدبختوں سے راضی ہو سکتا ہے۔

اخلاق و سیاست

لیکن فرعون کے جبر و استبداد، غرور و عناد اور حکومتِ ابلیسی کے گھمنڈ نے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دریائے لطف کے ایک قطرے سے بھی تشنہ لب رکھا، اور دریائے احمر کی لہروں میں اُن کی معجزانہ قوت نے نہایت عبرتناک طور پر بحرِ عدم کے ساحل تک پہنچا دیا۔ تاہم سیاستِ الٰہی فطرۃً رحم کے ساتھ ہم آغوش رہنا چاہتی تھی۔ فرعون کو اس کے تمرد نے اگرچہ اس تلطف آمیز سیاست سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا، لیکن جب دنیا کے ساتھ تمدن نے اور زیادہ ترقی کی، تو اخلاق و سیاست کی تصویریں ایک مرقع میں نظر آگئیں۔ اسلام اسی اخلاق و سیاست کا مجموعہ ہے۔

لیکن ہر اجتماع و ترکیب سے پہلے اس کے متفرق اجزاء کا الگ الگ ہونا ضروری ہے، اور ہر اعتدال کے لیے افراط و تفریط کا وجود لازمی ہے، سیاست کا ایک جزو یعنی قوت کو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیدا کر دیا تھا، اور اس کی نمائش دریائے

انتہا میں ہو چکی تھی۔ لیکن دُوسرا جُزو یعنی اخلاق اب تک معدوم تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کو بھی پیدا کر دیا اور اس کے حریف یعنی سیاست و قوت کی رگ گردن کاٹ ڈالی۔ یہود ٹھوس پتھر کی طرح سخت تھے لیکن حضرت مسیحؑ نے اپنی مُعجزانہ آتش بیانیوں سے اُن کو اس قدر گداز کر دیا کہ وہ ایک سیال مادہ بن گئے جو ہر قوت کے سامنے جُھک جاتا تھا، لچک جاتا تھا، دب جاتا تھا۔

اگر کوئی شخص اُن کے گال پر ایک طمانچہ مارتا تھا تو انہوں نے کہا کہ وہ اپنا دُوسرا گال بھی اُس کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اگر کوئی شخص ایک میل اُن سے بے گار لینا چاہتا تھا تو وہ دو میل تک اُس کا بوجھ پہنچا دیتے تھے۔ اظہارِ قوت کا سب سے بڑا ذریعہ حکومت ہے۔ لیکن انہوں نے دنیوی حکومت کے لیے کچھ نہ چاہا اور صرف خدا کے غریب ہی بندوں کو آسمانی حکومت کی بشارت دی۔ قوت کی نمائش کے لیے جنگ ناگزیر ہے، لیکن انہوں نے کہا کہ اپنے دشمنوں کو بھی پیار کرو غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں قوت جس درجہ افراط تک پہنچ گئی تھی، ٹھیک اسی کے مقابل حضرت مسیحؑ نے اس کو درجہ تفریط تک پہنچا دیا۔ اگرچہ اپنے اپنے وقتوں میں دونوں چیزیں صحیح اور عین اعتدال تھیں۔

اُمّت وسطٰی

اس بناء پر اعتدال کُلّی و دائمی کے لیے جس قسم کے الگ الگ افراط و تفریط کی ضرورت تھی، اب وہ پوری ہو گئی، اور قوانینِ ارتقاء جس جامع و مکمل مذہب کو ڈھونڈھ رہے تھے، اُس کے ظہور کا وقت آگیا پس زبانِ الٰہی نے اس معتدل اُمّت کے پیدا ہونے کی بشارت دُنیا کو سُنادی۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ الخ (۲:۳۷) — اسی طرح ہم نے تم کو ایک عدل و توسط کی قوم بنایا تاکہ تم لوگ دُنیا کے لیے نمونہ بنو، اور پیغمبر تمہارے لیے نمونہ ہو۔

داعی مذہب اِسلام نے اِس "اُمّت وسطا" کے لیے اپنا اعلیٰ نمونہ قائم کردیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چونکہ ایک سخت طاقتور بادشاہ اور سخت جابر قوم کا مقابلہ کرنا تھا اس لیئے خدا نے اُن کو فطرتاً پُرجلال بنایا تھا۔ اسی بناء پر فرعون کے سامنے نرم کلامی کی تلقین کرنا پڑی۔ لیکن پیغمبر اسلام خود ہی فطرتاً رحم و شفقت، کرم و رافت، عفو و درگذر کا خُلق عظیم تھا۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (۳:۱۵۲) — یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم اُن کے لیے فطرتاً نرم خو پیدا کیے گئے اور اگر تُم سخت و سنگ دل ہوتے تو لوگ تمہارے گرد جمع ہی نہ ہوتے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے اپنی قوم کی ذلّت برداشت نہ ہو سکی، اور وہ چند دنوں کے بعد اس کو لے کر چلے گئے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے کامل تیرہ برس تک اپنی قوم کے ہدایت یاب ہونے کا انتظار کیا۔ طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کیں، اور اپنے متبعین کو مختلف قسم کے جسمانی مصائب میں مُبتلا دیکھا۔ باینہمہ خدا نے ان کو صبر و سکون کا اعلیٰ ترین معیار بتلا دیا تھا۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ الخ (۲۸:۲۷) — ان لوگوں کے ساتھ رہ کر صبر کرو جو صبح و شام اپنے خدا کی پکار میں سرگرم رہتے ہیں، اور صرف خدا کی مرضی کی تلاش کرتے ہیں اپنی نگاہ اُن سے نہ پھیرو۔

کفرزارِ مکّہ کی ایک ایک کنکری اگرچہ اس کے متبعین کو ٹھوکر لگانا چاہتی تھی، لیکن ان لوگوں نے داعیِ اسلام کے اُسوۂ حسنہ کی اِس عدیم النظیر طاقت کے ساتھ تقلید کی کہ ایک تنکے کو بھی نگاہِ گرم سے نہ دیکھا، بلکہ بعض موقعوں پر تو وہ کیا کہ اخلاقِ مسیحی اس کے آگے ہیچ ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ الخ (۲۵:۶۴) — اور خدا کے وہ بندے جو زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور جب جہلاء اُن کو نامعقول طریقے سے مخاطب کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ تم سلامت رہو۔ ہمیں اپنی راہ چلنے دو۔

لیکن اسی ضعف میں ان کی قوت کا راز بھی چھپا ہوا تھا۔ دُنیا میں ایک اصول ہی متضاد نتائج پیدا کرتا ہے کبھی تو قوت دب کر بالکل فنا ہو جاتی ہے، اور کبھی وہ جس قدر دبائی جاتی ہے، اُسی قدر اُبھرتی بھی ہے۔ اور آہستہ آہستہ اپنے بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کر لیتی ہے۔ پانی کی سوتیں بعض اوقات تو خاک پتھر کے اندر دب کر بالکل خشک ہو جاتی ہیں، لیکن کبھی اندر ہی اندر منابع پیدا کر کے زمین کے اندرونی حصّے میں اپنا جال پھیلا دیتی ہیں، اور ایک دن چشمے کی صورت میں اُبل پڑتی ہیں۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ قوت کی موت اور اس کی زندگی درحقیقت تربیت ہی پر موقوف ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام چونکہ یہود کی شقاوت کو توڑنا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے اپنا ایک خاص مظلومانہ نمونہ قائم کیا، لیکن پیغمبرِ اسلام مسلمانوں کو ایک طاقتور قوم و عزیز ترین ہستی بنانا چاہتا تھا۔ وہ آسمان کی بادشاہت غریبوں اور مسکینوں کو نہیں دیتا تھا بلکہ دُنیا کی بادشاہت کی بشارت سے مسکینوں کو صاحبِ تاج و تخت بنانے والا تھا۔ اِس لیے اُس نے ابتدا ہی سے ان کو عزم و استقلال کی تعلیم دی اور ایک بلند تر مطمحِ نظر

کے لیے تیار کیا چنانچہ اس مظلومی کے زمانے میں جب کہ ارضِ مکہ کی ایک ایک کنکری مسلمانوں کو ٹھوکر لگاتی تھی۔ اور دنیوی عیش و نعم کے تمام دروازے اُن پر بند ہو گئے تھے، اُس نے خدا کی نصرت سے معمور ہو کر بشارت دی کہ آج ظلم و جبر کے پتھروں کو اٹھا لو، کل کو تمام دُنیا تمہارا بوجھ اُٹھائے گی۔

شکونا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے آنحضرتؐ سے اپنے مصائب کی
قلنا الا تستنصر لنا الا تدعو اللہ لنا. شکایت کی اور کہا کہ آپ ہمارے لیے خدا سے مدد
قال کان الرجل فیمن قبلکم یحفر لہ فی الارض نہیں مانگتے اور اُس کی درگاہ میں دُعا نہیں کرتے؟
فیجعل فیہ فیجاء بالمنشار فیوضع علی آپ نے فرمایا کہ گذشتہ قوموں میں ایسے راسخ العزم
راسہ فیشق باثنتین وما یصدہ ذلک لوگ تھے کہ زمین میں گڑھے کھود کر انہیں ڈال دیا
عن دینہ ویمشط بامشاط الحدید ما جاتا تھا، پھر آرے سے اُن کے دو ٹکڑے کر دیئے
دون لحمہ من عظم او عصب وما یصدہ جاتے تھے اور لوہے کی کنگھیاں اُن کے بدن پر
ذلک عن دینہ واللہ لیتمن ھذا الامر چلائی جاتی تھیں، جو اُن کی رگوں کو ہڈیوں تک سے
حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضر الگ کر دیتی تھیں تاہم یہ آزمائشیں بھی اُن کو سچائی
موت لا یخاف الا اللہ؟ (بخاری جزو ۲ ص [illegible]) سے نہیں ہٹا سکتی تھیں۔ خدا کی قسم دین اسلام اس قدر کامل اور غالب ہو گا کہ ایک سوار یمن سے حضر موت تک اس طرح بے خوف و خطر چلا جائے گا کہ خدا کے سوا اُس کو کسی چیز کا ڈر نہ ہو گا۔

دُنیا کے خزائن و دفائن میں قوت کا خزانہ سب سے زیادہ قیمتی اور مستحق حفاظت ہے، اِس لیے اس کو ہر وقت اور ہر جگہ آسانی کے ساتھ صرف نہیں کیا جا سکتا۔ ہر چیز اجزاء کی تقسیم سے فنا ہو جاتی ہے، اور کوئی عظیم الشان نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی عرب

جاہلیت سے زیادہ فیاضی کے ساتھ کسی قوم نے جنگی قوت کو خرچ نہ کیا ہوگا لیکن انتشار و پراگندگی کے سوا اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہ ہوا۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۔ وہ متفق ہو کر تم سے نہیں لڑ سکتے صرف قلعہ بند گاؤں میں یا کسی دیوار کی آڑ میں چھپ کر حملہ کریں گے۔ وہ باہم نہایت سخت جنگ کرتے تھے، اِس لیے تم اُن کو ایک متحدہ جماعت سمجھتے ہو، لیکن جماعت صرف اتفاق ہی سے پیدا ہوتی ہے اور اُن کے دلوں میں اتفاق کہاں؟ وہ ایک نادان و بے عقل قوم ہے، اتفاق و اجتماع قواء کے فوائد نہیں سمجھتی۔

لیکن تکمیل مذہب، نشر امن و سلام، اور عدل و انصاف کے قیام کا جو مقصد اِسلام کے پیش نظر تھا، وہ ایک متفقہ جماعت اور متحدہ قوت کا محتاج تھا، اِس لیے وہ اپنی قوت کا خزانہ اِس طرح نہیں صرف کر سکتا تھا، جس احمقانہ طریقے سے اہل عرب صرف کیا کرتے تھے۔ متبعین اسلام کو کفار مکہ کی سفیہانہ آویزشوں پر صبر و تحمل کا جو حکم دیا گیا تھا، وہ نہ تو کسی قسم کی کمزوری پر مبنی تھا، اور نہ اس سے اخلاق مسیحی کی تکمیل مقصود تھی۔ بلکہ سیاسی مصالح کی بنا پر اس کے ذریعے قوت کے خزانے کو ایک اجتماع عظیم اور مقصد وحید کے لیے جمع کرنا اور محفوظ رکھنا مقصود تھا چنانچہ جب اس سیاست الٰہی کے اظہار کا وقت آگیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ الخ (۹:۷۴) اے پیغمبر کفار اور منافقین سے جہاد کرو، اور ان کے ساتھ پوری سختی سے پیش آؤ۔

تو قوت کا یہ سرچشمہ دفعۃً ابل پڑا، اور وہی فقیر و مظلوم مسلمان جنہوں نے سالہا

سال تک دشمنانِ حق کے مظالم خاموشی کے ساتھ سہے تھے، اس جوش و قوت کے ساتھ سرفروشی کے لیے تیار ہو گئے کہ آگ کے شعلے، سمندر کی موجیں، پہاڑوں کی چوٹیاں، تیروں کی بارش بھی اُن کے سیلاب کو نہ روک سکی؛

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شاورہ حین بلغہ اقبال ابی سفیان فقام سعد بن عبادہ فقال ایانا ترید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لو امرتنا ان نخیضہا البحر لاخضناہا ولو امرتنا ان نضرب اکبادہا الی برک الغماد لفعلنا (مسلم ص۳ ج۹۴)

آنحضرتؐ کو جب معلوم ہوا کہ ابوسفیان نے بدر کی طرف پیش قدمی کی ہے تو آپؐ نے صحابہ سے مشورہ کیا، انصار میں سے سعد بن عبادہؓ اٹھے اور کہا: کیا آپؐ کا روئے سخن ہماری طرف ہے؟ اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ہماری جان ہے، اگر آپؐ فرمائیں تو ہم دریا میں گھس پڑیں اور اپنے سینوں کو تلواروں کی میان سے ٹکرا دیں۔

لیکن یہ سیلاب ایک معتدل قوم کے دل سے اُمڈا تھا، اس لیے وہ دریائے احمر کی موجوں کی طرح ہر جسم کے نگلنے کے لیے اندھا دھند تیار نہ تھا، بلکہ اس کا حال بالکل مختلف تھا۔ جو تنکا اس کی سطح پر جس قدر جنبش پیدا کرتا تھا، اسی قدر مساوی و موزون طاقت کے ساتھ وہ اُسے تھپیڑے بھی لگاتا تھا؛

فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ الخ (۲:۱۹)

جو شخص تم پر ظلم کرے، تم بھی اُس پر اسی قدر ظلم کرو جس قدر اُس نے تم پر کیا ہے، اس سے آگے بڑھنے میں خدا سے ڈرو اور یقین رکھو کہ خدا صرف پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

سیاست و اخلاق کے جو اجزاء شریعتِ موسوی و عیسوی میں الگ الگ

بکھرے ہوئے پڑے تھے، اسلام نے اس میں باہم ترکیب دے دی، اور رحمت اور فیاضی سے سیاست پر اخلاق کے جزء کو غالب کردیا، لیکن مضمون بہت طویل ہو گیا ہے اور ہم اِس بحث کو نہیں چھیڑنا چاہتے یہ ایک مُستقل عنوان ہے، اور اللہ تعالیٰ درس و بیان معارف اسلامیہ کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

بہر حال صفوۃ القول یہ کہ اسلام جس طرح اخلاق و عقائد اور عادات و خصائل کا مکمل مجموعہ ہے، اسی طرح سیاسیات میں بھی وہ ایک کامل ترین مذہب ہے اور سیاستِ صحیحہ اور دینِ الٰہی دو الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں، بلکہ دینِ حق کا اہم ترین مقصد سیاستِ حقہ کا قیام ہی ہے۔ اس حقیقت کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے قرآن حکیم کو پڑھا ہے، مگر قرآن کے پڑھنے والے زیادہ نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب عقائد و عبادات کے تمام ارکان قائم ہو گئے تو اُن کے ساتھ اُس کے سرچشمۂ سیاست یعنی حکومت کی بھی تکمیل ہو گئی، اور دُنیا کو اس کی تکمیل کا مژدہ سُنا دیا گیا:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔

فلسفۂ احتساب

اللہ تعالیٰ نے مادۂ عالم کی تخلیق و تقویم صرف انسان کی نفع رسانی کے لیے کی ہے۔ جس طرح زمین کا فرش ہمارے لیے بچھایا گیا ہے۔ جس کو ہم پاؤں سے روندرہے ہیں، اسی طرح ہوا کا کرہ بھی ہمارے ہی لیے حرکت کر رہا ہے جس کو ہم ہاتھ سے چھو نہیں سکتے۔ جس طرح خاک کا ہر ذرہ ہمارے لیے فضائے عالم میں چمکتا پھرتا ہے، اسی طرح آفتاب بھی ہمارے ہی لیے اپنے محور پر گردش کر کے نور برسا رہا ہے۔ جس طرح ہمارے اعصاب کا باہمی اتصال ہمارے دماغ تک ایک احساس عام کی کیفیت کو نہایت سرعت کے ساتھ پہنچاتا رہتا ہے، اسی طرح تمام اجرام فلکیہ کی قوت جاذبہ سب کو ایک رشتے میں جکڑ کر اُن کے متفقہ فوائد و منافع کو ہمارے ہی لیے تقسیم کرتی رہتی ہے!

شئوون مادیہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اپنے اس احساسِ عام کا ذکر بار بار کیا ہے۔ پہلے ایک آیت میں فرمایا کہ آسمان و زمین کی ہر مخلوق اپنے ساتھ فوائد و منافع کا ایک بے شمار ذخیرہ رکھتی ہے اور خدا کے صالح بندے وہی ہیں جو ہمیشہ اس خزانے کی

جستجو میں مصروف رہتے ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۳: ۱۸۷)

یقیناً آسمانوں اور زمین کی خلقت نیز لیل ونہار کے اختلاف وطلوع وغروب میں ارباب عقل وبصیرت کے لیے حکمت الٰہی کی بڑی ہی نشانیاں رکھی گئی ہیں۔ وہ ارباب بصیرت جو کھڑے رہ کر، بیٹھے بیٹھے، لیٹے، لیٹے، غرض کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو اور اس کی قدرت وحکمت کو یاد کرتے رہتے ہیں اور کائناتِ سماوی وارضی کے اسرار وحقائق میں ہمیشہ تفکر کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر اس نقطۂ علم ویقین تک پہنچ جاتے ہیں کہ کائنات عالم کے کسی ایک ذرے کو بھی خدا تعالیٰ نے بغیر کسی مصلحت و نفع کے پیدا نہیں کیا ہے۔ اور یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی تخلیق وتکوین ہی کا نتیجہ نہیں ہے!

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ (۲۲، ۱۶)

اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے محض ایک کھیل تماشہ ہی نہیں بنایا ہے بلکہ ان میں سے ہر چیز اپنے اندر اپنی تخلیق کا ایک خاص مقصد، ایک خاص خاصہ، ایک خاص اثر اور ایک ممتاز علت رکھتی ہے۔

پھر اس کے بعد فرمایا کہ یہ تمام فوائد ومنافع صرف انسان ہی کے لیے مخصوص ہیں، لیکن چونکہ انسان زمین میں رہتا ہے اور اس کے فوائد سے آسانی کے ساتھ متمتع ہو سکتا ہے، اس لیے زمین ہی کے منافع کو خصوصیت کے ساتھ بیان فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۝

وہ رب السموٰت والارض ہی تو ہے جس نے زمین کی ہر چیز کو تمہارے لیے پیدا کیا، تاکہ تم اس سے کام لو۔

پھر متعدد آیتوں میں تمام بڑی بڑی مخلوقات کی تفصیل بیان فرمائی، اور ان کو اپنی ایک نشانی قرار دیا،

وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوظًا وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (انبیاء)

اور دیکھو ہم نے آسمان کو کُرۂ ارضی کے اوپر ایک محفوظ چھت کی طرح بنایا اور کس طرح اس میں سے اپنی حکمت و قدرت اور طرح طرح کے مصالح و اسرار کی نمود کی؟ پر انسان کی ضلالت ہے کہ باایں ہمہ اجرام سماویہ کی عجیب و غریب نشانیوں سے بھی گردن موڑے ہوئے ہے! پھر دیکھو، اس کے سوا اور کون ہے جس نے رات اور دن کے اختلاف کو زمین کے لیے قائم کیا؟ اور سورج اور چاند کو پیدا کیا، جو آسمان میں پیرتے رہتے ہیں؟

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ۔

(ابراہیم : ۲۷)

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اور اُوپر سے پانی برسایا۔ جس کی آبیاری سے تمہارے لیے طرح طرح کی غذائیں پیدا ہوئیں۔ پھر یہ تو اس پانی کے منافع کی تسخیر تھی جو اُوپر سے گرتا ہے لیکن جو پانی تمہارے قدموں کے نیچے بہہ رہا ہے، اُس کے منافع بھی تمہیں کو بخش دیے، چنانچہ سمندر کی دہشت انگیز قہاری پر تم کو اس طرح مسلط کر دیا کہ تم نے کشتیاں بنائیں اور وہ اس سہولت سے پانی میں چلتی پھرتی ہیں، گویا سمندر بھی خشکی کی طرح تمہارا جولانگاہ ہے اور تم اس کے جس حصے میں جانا چاہو خشکی کی طرح چل کر جا سکتے ہو!

كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا

اسی طرح ہم نے چار پایوں کو تمہارے آگے مسخر کر دیا تاکہ تم اللہ کی نعمتوں سے کام لو۔ کیا ہم نے زمین کو

وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا وَخَلَقْنٰکُمْ اَزْوَاجًا؟ (انبیاء: ۱۷) تمہارے لیے ایک فرش کی طرح نہیں بچھا دیا؟ کیا وہ ہماری ہی حکمت و قدرت نہیں ہے کہ پہاڑوں کی بلندی کی اور اس پر میخوں کی طرح نمود کی؟ پھر کیا ہم ہی نہیں جس نے تم کو دو جنسوں میں منقسم کر دیا؟

مادہ اور قوت

لیکن دُنیا مادہ اور قوت، دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لیے دُنیا کا کوئی عمل ان دونوں کی آمیزش کے بغیر انجام پذیر نہیں ہو سکتا۔ نظامِ فطرت کی ہر کڑی اس وقت تک بکھری ہوئی پڑی رہتی ہے جب تک کہ قوت اس میں تنظیم و ترتیب پیدا نہ کر دے، اور اسی کا نام تکوین ہے۔ پس اِس بناء پر خدا نے ان شؤون مادیہ کے ساتھ ہمارے اندر مختلف قواء بھی پیدا کر دئے، جو مادۂ عالم سے فائدہ اُٹھانے کی کامل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم پر جا بجا ان قوتوں کے ذریعے بھی احسانِ الٰہی جتایا گیا ہے؛

قُلْ هُوَ الَّذِیْ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ (ملک) کہہ دو کہ اُسی کی ذاتِ خالقِ کائنات ہے جس نے تم کو پیدا کیا، اور تمہارے اندر حواس باطنی و ظاہری اور ان کی قوتیں ودیعت کیں۔

اِن قوتوں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے کامل وسعت و بسط کی ضرورت تھی۔ اِس لیے خدا نے اِس احسان کی بھی تکمیل کر دی؛

قُلْ هُوَ الَّذِیْ ذَرَاَكُمْ فِی الْاَرْضِ وَاِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝ خدا ہی نے تمہیں زمین میں پھیلا دیا ہے کہ اپنی قوت سے پوری وسعت کے ساتھ فائدہ اٹھاؤ، اور پھر وہی تم کو اپنی طرف سمیٹ بھی لے گا۔

قوتِ اعلیٰ و مدبرہ

لیکن یہ قوتیں برق و بارود اور کہربائیت و دخانیت کی طرح حرکت پیدا کرنے کی تو قوت رکھتی ہیں مگر وہ انسان کو بذاتِ خود منزلِ مقصود پر نہیں لے جاسکتیں۔ وُہ صرف حرکت پیدا کرنا جانتی ہیں، لیکن حرکت کے لیے چپ و راست، یمین و یسار، جنوب و شمال کی تمام راہیں یکساں ہیں۔ وہ راہ متعین نہیں کرسکتی اس لیے یہ قوتیں خود زمین کے نشیب و فراز میں تمیز نہیں کرسکتیں، اور خدا ہی نے ان کو خیر و شر کے یہ دونوں راستے دکھا دیئے ہیں۔

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (البلد ۸: ۱۰)

کیا ہم نے انسان کے لیے آنکھیں، ہونٹ اور زبان بنا کر خیر و شر، حق و باطل، یمین و شمال کی دونوں گھاٹیاں اُسے نہیں دکھا دیں؟

اس لیے جس طرح انجن کو ایک سائق (ڈرائیور) کی ضرورت ہوتی ہے کہ اسٹیم کی طاقت کو سیدھی راہ پر لگائے، اسی طرح یہ قوا بھی ایک ذی شعور محاسب کے محتاج ہوتے ہیں جو ان میں تنظیم و ترتیب، توافق و تطابق، اور صحیح دکون فعالیت پیدا کرے۔ اور بالفاظ سادہ تر یہ کہ اُن سے ٹھیک ٹھیک صحیح و عادلانہ کام لے۔

اس لیے خدا نے ہر چیز کے اندر فطرۃً اِن محاسب کو بھی پیدا کر دیا:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى

میرا پروردگار ہے جس نے ہر چیز کی خلقت کی تکمیل کی، اور پھر اس کو حواس ظاہری و باطنی دے کر راہِ عمل دکھا دی۔

لیکن انسان کو فطرت نے یہ حصّہ اور تمام مخلوقات سے زیادہ دیا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (والتین: ۴)

ہم نے انسان کو ایک بہترین فطرتِ علوا لسد تقویمہ کے قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہی فطرتِ صحیحہ اور خلقتِ مستقیمہ ہے جو انبیاء کرام کے اندر نمایاں ہوتی ہے۔ اسی لیے وُہ خدا کے اِس احسان کا ذکر بار بار کرتے ہیں۔ اور یہی فطرت اصلیہ صالحہ ہے جو ان کے عصر و دور کی تاریکی و ضلالت کے اندر چمک کر حقیقتِ محبوبکا روشن راستہ دکھا رہتی ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ○

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا، ایک خدا کو چھوڑ کر تم نے اپنی پرستش کے جو جھوٹے معبود بنا لئے ہیں۔ مَیں نے اُن سب سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ مَیں صرف اُسی ایک معبودِ حقیقی کا ہو رہا ہوں جس نے مجھے پیدا کیا۔ اور چونکہ مجھے پیدا کیا اس لیے صرف وہی ہے جو میری فطرتِ سلیمہ کے ذریعے میری ہدایت کرے گا!

ارکانِ ثلاثہ، تقویم عالم

پس دنیا کا نظامِ فطرت تین جزوں سے مکمل ہوتا ہے: مادہ، قوت، اور ان دونوں سے بالاتر ایک، ذی شعور طاقت، جو ان دونوں میں ربط و اتحاد پیدا کرتی ہے، اور وہ فطرت صالحہ و سلیمہ ہے جو اصلاً خود انسان کے اندر موجود ہے۔

خدا تعالیٰ نے نظامِ عالم کی ان تینوں کڑیوں کا ذکر بہ ترتیب ایک سورہ میں کیا ہے۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ○ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ○ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا ○ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا ○ وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا ○ وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا ○

سُورج اور اُس کی حرارت و نورانیت! چاند جو اس کے بعد ضیا گستر ہوتا ہے! روزِ روشن جو رات کی تاریکی کا پردہ چاک کر دیتا ہے رات کی ظلمت جو دن کی روشنی کو

نَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا (الشمس ۱:۱)

چھپالیتی ہے! آسمان اور اس کی عجیب وغ بلندی زمین اور اس کا حیرت انگیز پھیلاؤ اور پھر مادہ عالم کے ان تمام مظاہر و شیون کے بعد روح انسانی اور اس کا وہ خالق مطلق جس نے اس میں ایسی مناسب، موزوں، مستقیم و معتدل فطرت صالحہ رکھی، اور بالآخر خیر و شر، حق و باطل، صحت و سقم، عدل و اسراف، نور ظلمت دونوں راہوں کو اس پر کھول دیا۔ پس اب کامیاب وجود وہ ہے جس نے اپنی قوت محتسبہ کے عمل سے اپنی فطرت صالحہ کو بالکل پاک اور بے آمیزش رکھا، اور نامراد انسان وہ ہے جس نے اُسے ضائع کر دیا!!

اب دیکھو کہ اس سورۂ کریمہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مظاہر شیون مادیہ سے شہادت دلائی ہے، اس کے بعد نفس انسانی کا ذکر کیا ہے اور اس کے تسویۂ فطری کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آخر میں فلاح و خسران کا یہ معیار بتلایا ہے کہ الہام خیر و شر کی کشاکش و تصادم میں مستقیم و محتسب رہنا اور فطرت صالحہ کو ضلالت کی آمیزش سے پاک رکھنا۔ پس پہلا درجہ مادہ کا ہے دوسرا قوت کا، تیسرا ان سب سے بالاتر ذی شعور محتسبہ و عاملہ کا۔

یعنی آخری جزء جو مادہ و قوت میں ربط و توافق اور پھر عمل و صرف صحیح پیدا کرتا ہے فی الحقیقت احتساب کا سنگِ بنیاد ہے اور اسی پر امر بالمعروف والنہی عن المنکر کی عظیم الشان دیواریں قائم ہوئیں۔ قرآن حکیم نے اُسے "امر بالمعروف والنہی عن المنکر"۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا کہا ہے اور فطرت کا علم صحیح بتلاتا ہے کہ کائنات کا نظام عدل و تکوین درحاصل انہی تین رکنوں پر قائم ہے۔

مدارج احتساب

لیکن تمام نظامِ عالم ترقی پذیر ہے، اِس لیے اس کی ہر کڑی ترقی کی طرف آگے قدم بڑھا رہی ہے۔ مادۂ عالم آغازِ خلقت سے اب تک سینکڑوں قالب بدل چکا ہے۔ قوائے جسمانی نے بچپن سے بڑھاپے تک ترقی و انحطاط کی سینکڑوں منزلیں طے کی ہیں۔ پس اِس ارتقاء و نشوو کے اصول پر قوتوں کے ساتھ ساتھ قوتِ احتساب بھی ترقی کرتی رہتی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے انسان کی خود فطری قوت احتساب محاسبہ کرتی ہے۔ انسان کے اندر سے ہمیشہ بُرائی کی صدا اُٹھا کرتی ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْءِ (یوسف) نفس بُرائی کے لیے بہت ہی بڑا حکم دینے والا ہے۔

اِس لیے اس کی قوت احتساب سب سے پہلے اُسی کے اندر عمل کرتی ہے۔ گناہ کرنے کے بعد ہر شخص کو جو ندامت ہوتی ہے اور اس پر اس کا ضمیر جس طرح ملامت کرتا ہے، دراصل اسی فطری احتساب کا اثر ہے۔

لَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ اس پاک روح کی قسم جو گناہ کرنے کے بعد انسان کو بہت ملامت کرتی ہے۔ (۲:۷۵)

اصول ارتقاء کے بموجب ترقی کا یہ وہ نقطہ ہے جہاں سے جسمانیات میں حرکت کر کے جمادات۔ نباتات کے قالب میں آتے ہیں۔ اس کے بعد اس قوت کے حیوانی مظاہر کی منزل شروع ہوتی ہے۔ حیوانات کی طرح انسان بھی اپنے بچوں کی تربیت و رہنمائی میں اس قوت کو صرف کرتا ہے، اور جو آگ اس کے اندر بھڑک رہی ہے اُسی کو اس کے اندر بھڑکانا چاہتا ہے۔

يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (لقمان)

اے بیٹے! صلوۃ الٰہی کو قائم کر، نیکی کا لوگوں کو حکم دے! برائی سے روک! اور اس فرضِ احتساب کے ادا کرنے میں جو جو تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں اُن پر صبر کر! یہ بڑے ہی پختہ ارادے اور اعلیٰ درجے کا کام ہے۔

حیوانات کی انتہائی منزل کی سرحد سے انسانیت کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ غرضیکہ ایک انسانِ کامل منصۂ عالم پر جلوہ گر ہوتا ہے، اور خدا کے نور کو اپنے اندر جذب کر کے دُنیا کے سامنے نمودار کرتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (نحل: ۹۳)

خدا عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم کرتا ہے، اور ہر قسم کے ظلم سے روکتا ہے خدا یہ نصیحت اس لیے کرتا ہے کہ شاید تم لوگ عبرت پکڑو۔

چاند دُنیا کو وہی روشنی دکھاتا ہے جس کو اُس نے آفتاب سے حاصل کیا تھا۔ اس لیے یہ انسانِ کامل بھی وہی فرض ادا کرتا ہے جس پر مامور کر کے خدا نے اس کو بھیجا تھا۔

يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ (اعراف ۱۵۶)

اُن کو نیکی کا حکم دیتا ہے، برائیوں سے روکتا ہے، مفید و صالح چیزوں کو حلال اور بُری چیزوں کو حرام کرتا ہے۔

اب الٰہی اوصاف و مناقب کے ساتھ متصف ہو کر اُس کی پاک نسل دُنیا میں پھیلتی ہے اور انسانیت کاملہ کا ظہورِ عام ہو جاتا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تم دنیا کی بہترین اُمّت ہو جس کو خدا نے دُنیا کی

تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آلِ عمران) — ہدایت کے لیے نمایاں کیا۔ کیونکہ نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو۔

ارتقاء روحانی

ترقی کے اِس نقطے پر پہنچ کر ارتقاء کی وہ چاروں منزلیں طے ہو جاتی ہیں، جس کے ہفت خوان کے طے کرنے کا سہرا (EVOLUTION) کے سر پر باندھا گیا ہے۔

لیکن ارتقاء مادی اور امر بالمعروف کے مدارج میں ایک دقیق فرق ہے۔ قائلین مذہب نشو و ارتقاء کے مذہب میں جب جمادات کی ترقی اپنے آخری درجے تک پہنچ جاتی ہے اور انسان کی نسل زمین پر پھیل چکتی ہے، تو مادی قوانینِ ارتقاء یک قلم معطل ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد وہ کوئی عمل جدید نہیں کرتے لیکن امر بالمعروف والنہی عن المنکر اپنے آخری درجے پر پہنچ کر ایک جدید قوت پیدا کرتی ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں "صلوٰۃ الٰہی" کہتے ہیں "صلوٰۃ" کے اندر وہ تمام اعمال کا مادہ حصہ و عادلہ داخل ہیں جن کو عبودیت الٰہی کے ارتفاع و علو کے ساتھ دنیا میں ایک انسان کامل انجام دیتا ہے، اور اس طرح ہر عالم "انسانی فعل" ایک مزید درجۂ ترقی و نشو پاکر "عبادت" بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہی قوت ہے جو اپنی خاموش زبان سے دُنیا کی ہدایت کرتی ہے:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ — نماز ہر قسم کی بُرائیوں سے بچاتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کو یہی اعلیٰ ترین عملی قوت شرک و بت پرستی سے روکتی تھی۔ اِس لیے ان لوگوں نے کہا:

اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱: ۸۷) — کیا تمہاری عبادت تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ اُس راہ کو چھوڑ دیں جس پر ہمارے باپ دادا کا عمل تھا اور جس چیز کی وہ پوجا کرتے تھے۔

قانونِ تنزل

لیکن قوتِ احتساب نے جس طرح ترقی کی تھی اِسی طرح انحطاط کے مدارج بھی شروع ہوتے ہیں۔ جو انسان کہ اپنے بچوں کی قوتِ احتساب کو ترقی دے سکتا تھا، ایک وقت آتا ہے کہ خود اپنی قوت محتسبہ ہی کو فنا کر دیتا ہے۔ اور اس کے تمام حواس ظاہری و باطنی، خارجی ضلالت کے اثر سے معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہر شخص علانیہ منکرات و معاصی کا ارتکاب کرنے لگتا ہے اور اپنی فطرت صالحہ و سلیمہ کو یک قلم مسخ کر دیتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے کہا تھا:

أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ	تم لوگ فعل خلاف وضع فطری کے مرتکب ہوتے ہو دن دھاڑے ڈاکہ مارتے ہو اور اپنی صحبتوں میں
(عنکبوت: ۲۹)	علانیہ برائیوں کا ارتکاب کرتے ہو۔

اِس لیے اب زندگی کے مدارج نباتاتی و حیوانی دونوں فنا ہو جاتے ہیں۔ انسانیت کاملہ کا ظہور اُنہی کی تدریجی ترقی کا نتیجہ تھا۔ پس جب اس کی ابتدائی کڑیاں ٹوٹ جاتی ہیں تو انسانیت کاملہ کا درجہ بھی جو آخری کڑی کا حکم رکھتا ہے، فنا ہو جاتا ہے، بلکہ فنا کر دیا جاتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ	وہ لوگ جو آیات الٰہیہ کا انکار کرتے ہیں اور ان کا سب سے بڑا انکار یہ ہے کہ ان کے حاملین اور
(۳: ۲۰)	داعیوں کو قتل کرتے ہیں

اب انہی لوگوں کے ہاتھوں اس انسان کامل کی وہ نسل بھی مفقود ہو جاتی ہے جو اس فرض و احتساب کو ادا کرتی تھی۔

وَیَقۡتُلُوۡنَ الَّذِیۡنَ یَاۡمُرُوۡنَ	اور یہ بدبخت ان پاک انسانوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں،
بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ	جو عدل اور صراطِ مستقیم کی طرف انسانوں کو بلاتے
(۲۰:۳)	اور امرِ حق کا حکم دیتے ہیں۔

لیکن ترقی و تنزل کے یہ مدارج ایک ہی اصول کے تابع ہیں۔ جس طرح نسلِ حق تدریجی ترقی کے بعد پیدا ہوئی تھی، اُسی طرح بتدریج فنا بھی ہوتی ہے۔ امر بالمعروف اور احتساب انسانی کی ترقی کے کئی درجے تھے، اسی طرح اس کا تنزل بھی تین درجوں میں منقسم ہے۔ ابتداء میں یہ گمراہ نسل اگرچہ خود نیکی پر عمل نہیں کرتی، تاہم دوسروں کو نیکی کرنے کا حکم دینا اور مامور رہتی ہے۔ یہ تنزل کا پہلا درجہ ہے۔

اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ	دوسروں کو تو نیکی کا حکم دیتے ہو لیکن خود اپنے نفسوں کو
اَنۡفُسَکُمۡ (بقرہ)	بھول گئے ہو کہ سب سے زیادہ اس حکم کے مستحق ہیں؟

لیکن رفتہ رفتہ یہ حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ خود یہی نسل دوسروں کو برائی کا حکم بھی دینے لگتی ہے اور اس طرح احتساب حق کا آخری نقش پا بھی مٹ جاتا ہے۔ تاہم یہ دوسرا درجہ ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَبۡخَلُوۡنَ وَیَاۡمُرُوۡنَ	وہ بدبخت جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی
النَّاسَ بِالۡبُخۡلِ	بخل کے لیے حکم کرتے ہیں اور اس طرح اللہ کی دی ہوئی
	طاقت کو اللہ کی راہ میں نہ تو خرچ کرنا چاہتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں!

اس کے آگے ایک اور درجہ آتا ہے۔ دوسرے درجے میں گر کر یہ نسل برائی کا حکم دیتی تھی۔ لیکن ابھی تک نیک کاموں میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتی تھی۔ اب تیسرا درجہ [illegible] کے فقدان اور شیطان کے تسلط کے اعلان کا آتا ہے، اور صرف یہی

نہیں ہوتا کہ بُرائی کی جائے اور برائی کی تعلیم دی جائے بلکہ ان دونوں مدارج اہلبیت کے ساتھ یہ منتہائے شیطنت بھی شروع ہو جاتی ہے کہ پرستاران باطل حق کے خلاف جہاد کرتے ہیں اور سچائی اور نیکی کو دنیا سے بالکل معدوم و فنا کر دینا چاہتے ہیں:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ الخ — منافق مرد اور منافق عورتیں جو اعانت باطل اور مخالفت حق میں ایک دوسرے کے ساتھی اور رسازشی ہیں بُرائیوں کا حکم دیتے ہیں اور ساتھ ہی دُنیا کو نیکی سے روکتے بھی ہیں۔

انحطاط کا یہی درجہ ہے جہاں پہنچ کر اس نسل کا خاتمہ ہو جاتا ہے آمرین بالمعروف علانیہ قتل کیے جاتے ہیں، طرح طرح کی تکلیفوں اور قسم قسم کی دُنیوی سزاؤں سے اُن کی جماعت کو ہلاک کیا جاتا ہے اور اس طرح وُہ رُوح صالح فنا کر دی جاتی ہے جو دُنیا کو ایک عام دعوتِ عمل دیتی تھی، اور وہی انتظام انسانیہ کبریٰ کی آخری منزل تھی۔

لوازم و عوارض

اس کی تفصیل سے تم نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ایک رُوح عامہ کا نام ہے جو تمام کائناتِ ہستی پر حکومت کرتی ہے، لیکن رُوح کے مظاہر مختلف ہوتے ہیں۔ حیوان اور انسان دونوں میں روح ہے، لیکن دونوں کے آثار و نتائج مختلف ہیں۔ رُوح حیوانی میں وہ نُور نہیں ہے جس سے انسان کا دماغ روشن ہے۔ اسی طرح امر بالمعروف کی رُوح اگرچہ فطرتاً تمام عالم میں ساری ہے، لیکن ترقّی و تنزل کے لحاظ سے اس کے مدارج مختلف ہیں۔ اِس رُوح کا سب سے اعلیٰ مظہر خود خدائے ذوالجلال ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ — خدا عدل، احسان، اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور ہر قسم کی بُرائیوں اور ہر قسم کے غضب

وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ — حقوق سے روکتا ہے۔

لیکن خدا کی روشنی کو وہی لوگ دیکھتے ہیں جن کے دل میں خدا کا خوف ہوتا ہے:

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (فاطر: ۲۸) — خدا کے بندوں میں صرف وہی لوگ خدا کا خوف اپنے اندر رکھتے ہیں جو ارباب علم و بصیرت ہیں۔

اس لیے یہ روح بھی سب سے پہلے انہی کے قلب میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا احساس پیدا کرتی ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (نازعات: ۴۰) — وہ شخص جو اپنے خدا سے ڈرا اور جس نے نفس کو ہوا پرستی سے روکا۔

پھر یہ روح ترقی کر کے بڑے بڑے مظاہر ڈھونڈھتی ہے کبھی جزو نبوت بن جاتی ہے۔ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ الْخَبٰٓئِثَ۔

یہ آیت کریمہ اوپر گذر چکی ہے۔

کبھی ایک امت مسلمہ دعادلہ کی خلافت کے اندر سے نمایاں ہوتی ہے:

الَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ — وہ خدا کے مومن بندے کہ اگر ہم ان کی خلافت کو دنیا میں قائم کردیں تو ان کا یہ کام ہوگا کہ صلوٰۃ الٰہی کو قائم کریں گے، اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

کبھی ایک مستعد گروہ کے اندر جلوہ گر ہوتی ہے۔

اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ — وہ حق پرست جماعت جس کے افراد کا یہ حال ہے کہ

الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ. يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (آل عمران ۱۱۲ و ۱۱۳)	راتوں کو اُٹھ کر اللہ کے کلام کی تلاوت کرتے ہیں ۔ اور ان کے سر اُس کے آگے جھکے ہوتے ہیں ۔ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہیں ۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں ، برائی سے روکتے ہیں اور نیک کاموں کے لیے سرگرم رہتے ہیں ، سو یہی لوگ ہیں کہ ان کا شمار صالحین میں ہے

لیکن ہر حالت میں وہ ایک نئی روشنی ہے جو دُنیا ہی کو دی جاتی ہے ، اِس لیے سب سے پہلے وہ آمرین بالمعروف کو ٹھوکر سے بچاتی ہے ۔ وہ دنیا کے نشیب و فراز اور سنگ و خاشاک سے بچ کر صحیح و سالم نکل جاتے ہیں :

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ (اعراف)	اور جب ان لوگوں نے اللہ کی بخشی ہوئی ہدایت کو بھلا دیا جو آمرین بالمعروف کے ذریعے ان کو یاد دلائی جاتی

تھی ، تو ہم نے اُن کی برائیوں سے داعیان حق کو بچا لیا تا کہ بدکاروں کا ظلم انہیں نقصان نہ پہنچا سکے ۔
اگر یہ روشنی نہ ہوتی تو تمام دُنیا ایک ظلمت کدہ ہلاکت بن جاتی اور عقل کی آنکھ کچھ بھی نہ دیکھ سکتی :

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِيْنَ (هود : ۱۱۶)	جو قومیں تم سے پہلے گذر چکی ہیں ان میں ایسے داعیان حق کیوں نہ ہوئے جو ظلم و فساد سے روکتے ، بلاشبہ ہوئے ۔ البتہ ان کی تعداد تھوڑی ہی تھی اور ارباب اصلاح و معروف تھے جن کو بندگان ضلالت نے نقصان پہنچانا چاہا مگر ہم نے بچا لیا ۔ اور ارباب ظلم و فساد اپنے فسق و فجور ہی میں

مبتلا رہے ۔ بلاشبہ یہ مجرموں میں سے تھے کہ انہوں نے قانون الٰہی سے بغاوت کی

لیکن عام لوگوں پر اس کی ترقی و تنزل دونوں کے مدارج کا اثر یکساں پڑتا ہے۔ جس طرح دھندلی روشنی کو ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح آفتاب کے قرص پر بھی ہر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ جب عملہ کی قوت اکتساب بے اثر ہو جاتی ہے، تو فطرتِ محتسبہ تمام دُنیا کا اکتساب براہ راست نہیں کر سکتی۔ اس وقت خدا اپنے ایک کامل بندے کو چُن لیتا ہے جو نُورِ الٰہی کو جذب کر سکتا ہے۔ جس کی بصیرت میں آفتابِ الٰہی کے دیکھنے اور اکتساب نُورانیت کی طاقت کامل موجود ہوتی ہے، اور وہ دوسروں کے اندر بھی اِس روشنی کی کرنوں کو نافذانہ پہنچا سکتا ہے۔ یہی درجہ مقام اعظم نبوّت ہے۔ اور اسی لیے دُنیا میں ہر شخص کو چاہیے کہ بغیر کسی بحث مباحثے کے اس کے احکام کو تسلیم کر لے۔ کیونکہ ہر شخص بذاتِ خود اِس نُور کا کسب نہیں کر سکتا۔ وُہ ایک قوت قائمہ منورہ کا محتاج ہے۔ یہ قوت منورہ مقام نبوّت کی فعالیت ہے، اور اسی بنا پر خدا نے مُسلمانوں کو حکم دیا ہے:

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر: ۷) رُسول تم کو جن چیزوں کا حکم دے اس پر عمل کرو اور جس چیز سے روکے رک جاؤ۔

پس یہ حکم جبری نہیں ہے، بلکہ عین فطری ہے۔ اور فطرت کے سامنے انسان کو گردن جھکا دینی چاہیے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی ہر شخص کا فرض ہے کہ اس روشنی کو دُنیا میں پھیلائے اور اگر دُنیا اِس کو قبول نہ کرے تو مایُوس نہ ہو کیونکہ نیکی کا عمل کبھی بے اثر نہیں رہ سکتا، اور دنیا کو بہر حال بُرائی سے روک ہی دیتا ہے۔

لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (مائدہ: ٦٨)

اگر علماء و احبارِ حق یہودیوں کو بُری باتوں کے کہنے اور حرام کھانے سے نہ روکتے، تو وہ اس سے بھی زیادہ برائیوں اور بدکاریوں میں ڈوبتے، جتنی (باوجود مجددِ دینِ حق اور آمرینِ بالمعروف کی تعلیمات کے) ان میں نظر آرہی ہیں۔

الاصلاح والافساد

(۱)

دُنیا عالم کون و فساد ہے۔ اس میں ایک چیز بنتی ہے تو دوسری بگڑتی ہے۔ ایک چراغ بجھتا ہے، تو دُوسرا جلتا ہے۔ کلیوں کے دہن تنگ کا نقشہ بگڑ جاتا ہے، تب پھولوں کا شگفتہ چہرا متبسم ہوتا ہے۔ قطرہ اپنی صورت بدل دیتا ہے، تب موتی اپنی آب و تاب دکھلاتا ہے۔ سیاہی اپنی روانی کھو دیتی ہے، تب صفحۂ قرطاس پر ایک نقش ثابت جلوہ آرا ہوتا ہے۔ یہ ابدی قانون ہمیشہ سے جاری ہے، اور ہمیشہ جاری رہے گا:

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ — ہر دن کی شان نت نئی ہے

قدرت کا یہی عمل ہے جس کو اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم میں آیاتِ الٰہیہ یعنی خدا کی نشانیوں سے تعبیر کرتا ہے، اور بندوں کو اس کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے:

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَّقُونَ ○

رات دن کے اختلافات اور ان تمام چیزوں کے تغیرات میں جن کو خدا نے آسمان و زمین میں پیدا کیا ہے، اس قوم کے لیے بڑی نشانیاں رکھی گئی ہیں، جو راہ تقویٰ اختیار کرتی ہے۔

قدرت کا یہ عمل افق عالم کے سوا خود انسان کے اندر بھی جاری ہے۔اس کو وہ خود محسوس نہیں کرتا، اِس لیے خدا محسوس کراتا ہے۔

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ اللہ کی نشانیاں صرف تم سے ہی باہر نہیں ہیں بلکہ خود تمہارے وجود کے اندر بھی موجود ہیں۔ پھر کیا تم اپنے وجود کو بھی نہیں دیکھتے؟

اِنسان دیکھتا ہے کہ ایک گھر بگڑتا ہے اور دُوسرا بنتا ہے، مگر کبھی اُن کی طرف دھیان نہیں کرتا۔ انسان کو بتایا جاتا ہے کہ اس کے جسم کے ذرات ہر وقت بدلتے رہتے ہیں، پھر بھی وہ جاننے کی طرح نہیں جانتا۔ لیکن یہ بے خبری، یہ بے حسی، یہ سرگشتگی بھی ایک فطرتی اصول کا نتیجہ ہے۔ اِس لیے یہ بھی خدا کی ایک بڑی آیت ہے۔

اِنسان جس چیز کو پیہم و متصل دیکھتا رہتا ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ بہت کم کرتا ہے۔ سُورج نکلتا ہے اور چاند کو اس کے سنہرے تخت پر بٹھا کر ڈوب جاتا ہے۔ یہ انقلاب حکومت کیسا عجیب و غریب ہے، لیکن انسان اپنی آنکھیں بند کرکے سو جاتا ہے۔ اور اس جلوے کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ وہ اس کو ہمیشہ دیکھتا رہتا ہے، اِس لیے تعجب اور کاوش سے دیکھنا نہیں چاہتا مگر جب دُنیا میں دفعتہً کوئی نیا انقلاب ہو جاتا ہے تو وہ دم بخود ہو کے رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہ دفعتہً ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

انسان اپنے مخفی اثرات کا بھی احساس نہیں کرتا۔ اس کے جسم کے ذرّے رفتہ رفتہ بدلتے رہتے ہیں اور اس کی عمر آہستہ آہستہ گذرتی جاتی ہے، مگر وہ ہوشیار نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ قبر کا دہانۂ خاک اس کے لیے کھُل جاتا ہے، اور آواز اٹھتی ہے۔

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۔ کثرت لذائذ و فوائد دنیوی کی غفلت نے تمہیں بیدار ہونے نہ دیا۔ یہاں تک کہ قبروں کا چہرہ تمہیں نظر آگیا!

لیکن فطرت الٰہی سب کی تربیت کرتی ہے۔ اگر جسم کے لیے دن اور رات ہیں، اگر آنکھ کے لیے خواب و بیداری ہے، اگر اعضا کے لیے سکون و حرکت ہے تو رُوح بھی ان انعاماتِ الٰہیہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ وُہ پھولوں کی سیج پر مست خواب رہتا ہے۔ اسی حالتِ غفلت میں دفعتًا رات کا پردہ پھٹتا ہے اور رُوح بیدار ہو جاتی ہے۔

لیکن تمہاری طرح تمہاری رُوح مُرغ سحر کی آواز اور بانگ موذن سے بیدار نہیں ہوتی۔ وہ بہت سوتی ہے، اور نہایت غفلت کی نیند سوتی ہے، اِس لیے اُس کے جگانے کے لیے بجلی کی کڑک، بادل کی گرج اور دھماکے کی آواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے، بادل گرجتے ہیں، طوفان اُمنڈتا ہے، آندھی چلتی ہے، زلزلہ آتا ہے، زمین پھٹتی ہے، تب کہیں جاکر وہ بیدار ہوتی ہے۔ اور اگر نہیں بیدار ہوتی، تو پانی کے ساتھ بہ جاتی ہے، آندھی کے ساتھ اُڑ جاتی ہے، زمین کی زلزلہ انگیز لرزش کے ساتھ پیوند خاک ہو جاتی ہے:

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِیْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَیْهِ الْقَوْلُ ۝

یہاں تک کہ جب ہمارے قانون تعذیب و انقلاب کا وقت آگیا اور عذاب کے تنور نے جوش ملا تو قوم نوحؑ کی ہلاکت کا سیلاب بہہ اُٹھا۔ اور ہم نے نوحؑ کو حکم دیا کہ اپنے لیے کشتی تیار کر دا!

فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْٓ اَیَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِیْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔

پس ہم نے اُن کے اُوپر آندھی بھیجی جو ہلاکت کے بُرے دنوں میں نمودار ہوئی، تاکہ انھیں ناکامی و ذلت کے عذاب کا مزا اِسی زندگی میں چکھا دیں۔

وَاَخَذَتِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوا الصَّیْحَۃُ فَاَصْبَحُوْا فِیْ دِیَارِھِمْ جٰثِمِیْنَ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا۔ ان کو ایک ناگہانی کڑک نے آ پکڑا۔ وہ اپنے گھروں میں بیٹھے کے بیٹھے ہی رہ گئے۔

کون و فساد روحانی

کون و فساد کا یہی دائمی عمل معتقدات و روحانیت میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک عقیدہ قائم ہوتا ہے، تو دوسرا بدل جاتا ہے۔ توحید نور افگن ہوتی ہے، تو شرک کی تاریکی مٹ جاتی ہے۔ دل میں ایک گھر کرتا ہے، تو تین کو اس سے نکلنا پڑتا ہے۔

یہ روحانی تغیرات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں، لیکن صرف انسان کی فطرت صالحہ ہی کو اس کا احساس ہوتا ہے۔ وہ ان کے نتائج کو چاند اور سورج میں ڈھونڈھتی ہے۔ مگر ناکامیاب ہوتی ہے، اور یہی ناکامیابی اس کا گنجینۂ مراد ہے:

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ جب چاند کو چمکتے ہوئے دیکھا تو کہا یہ میرا خدا ہے۔ فَلَمَّا اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ یَھْدِنِیْ رَبِّیْ لَاَکُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّیْنَ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَۃً قَالَ ھٰذَا رَبِّیْ ھٰذَآ اَکْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ لیکن جب وہ ڈوب گیا تو اس کی فطرتِ صالحہ بول اٹھی، اگر میرا خدا مجھے ہدایت نہ کرتا تو میں راہِ ہدایت سے بھٹک جاتا۔ پھر جب سورج کو چمکتے دیکھا تو کہا یہ میرا خدا ہے۔ یہ سب سے بڑا ہے۔ لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو اس نے کہا، لوگو! میری جستجو ان جلووں میں گم نہیں ہو سکتی۔ میری فطرت صالحہ نے حقیقت تک مجھے پہنچا دیا ہے۔ میں اُس چیز سے علیحدہ ہوتا ہوں جس کو تم شریک خدا بناتے ہو۔

لیکن ان تغیرات سے عام طور پر لوگ اس وقت تک بے خبر رہتے ہیں، جب تک کہ زلزلے کا ایک دھکا اُن کو ہوشیار نہیں کر دیتا۔ پس حرکت روحانی تو برابر

جاری رہتی ہے، مگر جمود و غفلت انسان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیتی ہے، اور وہ حرکت کے نتائج پر غور نہیں کر سکتا۔ اِسی غفلت اور مدہوشی کے عالم میں اچانک ایک پُرہیبت اور زلزلہ انگیز آواز سُنتا ہے۔

جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۱-۱۷) حق آیا اور باطل مٹ گیا، باطل مٹنے ہی کے لیے تھا۔

وہ گھبرا کے آنکھ کھولتا ہے، اور اس کو نظر آتا ہے کہ جو گھر تین سو ساٹھ تصویروں سے سجایا گیا تھا، اس کی زینت کے لیے صرف ایک ہی قندیل کافی ہے:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۳۵-۲۴) خدا ہی کی ذات آسمان و زمین کا اصلی نور ہے!

کون و افساد یا اصلاح و افساد

تم نے دیکھا؟ مادیات میں، معتقدات میں، روحانیات میں، اخلاق و عادات میں، کس ترتیب و انتظام کے ساتھ عمل کون و فساد جاری ہے؟ اصلاح و افساد کیوں کر دست و گریباں ہیں؟ نور و ظلمت کس طرح ہم آغوش ہیں؟ خیر و شر کس درجہ مخلوط ہیں؟ اصلاح کو افساد اور افساد کو اصلاح کیونکر مستلزم ہے؟

پس تم جس چیز کو "اصلاح" کہتے ہو، دُوسرا اسی کو "فساد" کہہ سکتا ہے، چُنانچہ فرعون نے کہا:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْۤ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (۴۰-۲۶)

فرعون نے کہا: مجھ کو چھوڑ دو کہ موسیٰ کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے خدا کو اپنی مدد کے لیے بلائے، میں ڈرتا ہوں کہ وہ تمہارا دین نہ بدل دے یا یہ کہ زمین میں فساد نہ پھیلائے۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ پر فساد پھیلانے کا الزام لگایا، حالانکہ حضرت موسیٰؑ کی ساری دعوت اسی لیے تھی کہ فرعون کو مفسد قرار دیتے تھے اور اس کے افساد سے دنیا کو نجات دلانا چاہتے تھے۔

منافقین سے کہا گیا۔

لَا تُفْسِدُوا فِی الْاَرْضِ۔ زمین میں فساد نہ کرو!

انھوں نے جواب دیا۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں مفسد کیسے ہو سکتے ہیں؟

لیکن بایں ہمہ اختلاط والتباس، افساد و اصلاح میں ایک حد فاصل بھی ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ بَیْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ ○ (الرحمٰن) خدا نے کھارے اور میٹھے دریاؤں کے پانی کو باہم ملا کر بہایا۔ پھر بھی ان دونوں کے درمیان ایک حد ہے جس سے آگے نہیں ہو سکتے۔

ایک دوسرے کی حد میں داخل ہو کر انسان اس پردے کو اٹھانا چاہتا ہے پھر بھی حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ اس لیے مفسد و مصلح کی تحقیقی تمیز صرف خدا ہی کر سکتا ہے۔ جس نے اس پردے کو قائم کیا ہے۔

وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ خدا ہی مفسد کو مصلح سے جدا کرتا ہے اور اس کا علم رکھتا ہے۔

تم نے اصلاح و افساد کو دیکھا، لیکن تم غور سے نہ دیکھ سکے، کیونکہ ان پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ تم کو اور زیادہ غور سے دیکھنا چاہیے، کیونکہ وہ آیاتِ الٰہی ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ	اور خدا کی آیات میں سے تمہارا رات کا سونا اور دن کو خدا کے احسان کی تلاش کرتا ہے۔

لیکن اس آیت کے اختلاف کے اندر اس سے بھی زیادہ محیر العقول آیتِ الٰہی ہے:

اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ ۔	رات دن کے اختلاف اور تمام عالمِ کائنات کے اختلافات کے اندر اربابِ تقویٰ کے لیے بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

اس لیے خدا نے اصلاح و افساد سے زیادہ اختلاف اصلاح و افساد کو اپنی قُدرت کاملہ کا مظہر بنایا ہے۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗٓ اُمُّ الْكِتٰبِ	خدا جس چیز کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم کرتا ہے، اور اُسی کے پاس ام الکتاب ہے۔

عالمِ کائنات اسی ام الکتاب کا ایک ورق ہے۔ اس کتاب کو اُلٹو تو تم کو اوّل ہی صفحے پر نظر آئے گا کہ دنیا ایک قانون فطری اور ایک نظام الٰہی کی تابع ہے، اور اس سے سر مو تجاوز نہیں کر سکتی۔ اصلاح و افساد بلکہ تمام نظامِ عالم اِسی قانون پر چل رہا ہے۔ تم کو دقیق حقیقت نظر نہیں آتی تھی، اِس لیے خدا نے خود ہی اس کی تفسیر بھی کر دی:

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۔	نہ سُورج کو یہ حق حاصل ہے کہ چاند کو پالے، نہ رات دِن سے پہلے آ سکتی ہے۔ سب اپنے دائرہ و محور میں گھوم رہے ہیں۔

جزئیات اصلاح و افساد

تم کس آسانی سے کہہ دیتے ہو کہ یہ افساد ہے، یہ اصلاح ہے۔ زید مفسد ہے، عمر مصلح ہے۔ لیکن تم کو اب معلوم ہوا ہو گا کہ اصلاح و افساد کا ایک قانون ہے۔ وہ ایک نظام خاص کا منبع ہے۔ اس لیے تم کو بے پروائی کے ساتھ کسی کو مصلح و مفسد کے خطاب دینے میں تامل کرنا چاہیے اور سب سے پہلے ایک منطقیانہ ترتیب کے ساتھ اصلاح و افساد کی حقیقت متعین کر لینی چاہیے۔

قرآن حکیم میں اس حقیقت کو ذیل کے عنوانات کے تحت میں واضح کیا ہے۔

(۱) جزئیات افساد و اصلاح اور ان کے آثار و علائم کی تعیین و تشخیص۔

(۲) اصلاح و افساد یا خیر و شر دنیا میں مخلوط اور بالکل ملے جلے ہیں، لیکن اصلاح افساد پر، خیر شر پر کماً و کیفاً غالب ہے۔ یعنی بلحاظ حقیقت کے بھی، بلحاظ وجود کے بھی اور بلحاظ نتائج کے بھی۔

(۳) ان دونوں کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے، جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کر دیتی ہے۔

(۴) اصلاح و افساد کا توازن طبعی صرف دین الٰہی کے ذریعے قائم رہ سکتا ہے۔

(۵) لیکن اس توازن کے قائم رکھنے کے لیے جزئیات عمل میں مصالح عامہ کا لحاظ ضروری ہے۔

(۶) اعمال صالحہ کی ایک محدود زندگی ہے اور جسمانیات کی طرح صحت و مرض یعنی اصلاح و افساد سے گھری ہوئی ہے۔

(۷) جمہوریتِ صالحہ اور اجتماعی قوت عاملہ اس کو امراض سے محفوظ رکھتی ہے،

اور اصلاح کو ترقی دیتی ہے۔

اب ان تمام مراتب پر بہ ترتیب غور کرنا چاہیے۔

بعض ابتدائی جزئیات

(۱) چور چوری کرتا ہے۔ ایک کا گھر برباد ہوتا ہے، لیکن خود چور کا گھر آباد ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ افساد بھی ایک دوسری صورت میں اصلاح ہے۔ بایں ہمہ اس کو ہر شخص افساد کہتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں پر جب مصر میں پیمانہ کی چوری کا الزام لگایا گیا تو انہوں نے کہا:

تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ (یوسف۔۷۳)	خدا کی قسم تم لوگ جانتے ہو کہ ہم اس لیے یہاں نہیں آئے کہ زمین میں فساد کریں اور ہم چور نہیں ہیں۔

(۲) ایک شخص اس سے بھی زیادہ ترقی کرتا ہے اور محدود چوری کی جگہ ڈاکے ڈالتا ہے۔ اس سے اگرچہ لٹنے والوں کی بستی بالکل لٹ جاتی ہے، مگر لوٹنے والوں کا گھر مال و دولت کی کان بھی بن جاتا ہے۔ پس اس میں افساد کے ساتھ اصلاح بھی ہے، مگر انبیاء کرام اس کو مایۂ فساد کہتے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا:

لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ (عنکبوت: ۲۹)	تم فعل خلاف وضع فطری کرتے ہو۔ ڈاکہ ڈالتے ہو، اور اپنی مجلسوں میں بداخلاقیوں کے کام کرتے ہو۔

یہ فساد ایسا عظیم تھا کہ بالآخر حضرت لوطؑ سے دیکھا نہ گیا اور وہ بے قرار ہو کے پکار اٹھے:

رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ خدایا مجھ کو اس مفسد قوم کے مقابلے میں نصرت دے!
(عنکبوت : ۳۰)

(۳) ایک شخص غیر فطری طریقوں سے لذت نفسانی حاصل کرتا ہے اور اس کو اپنے نفس کی بھلائی اسی میں نظر آتی ہے، وہ اس کو فلسفۂ عیش و امید کے لقب سے یاد کرتا ہے، لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یہ کیسا مفسدانہ فلسفہ ہے جو حفظ صحت کو، نسل کو، مال و دولت کو، انسان کی قوت طبیعی کو یکسر برباد کر دیتا ہے؟ انہیں نتائج مہلکہ کے لحاظ سے ایک پیغمبر خدا نے بے اختیار کہہ دیا تھا۔

رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ خدایا مجھ کو مفسد لوگوں پر نصرت عطا کر۔

(۴) ایک حکومت، ایک قوم کی حریت و آزادی سلب کر لیتی ہے، اس سے غلاموں کی طرح کام لیتی ہے، اس کی قوت کو فنا کر دیتی ہے، اس کی اخلاقی طاقت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس کا یہ عمل باطل یک ظلم سرچشمۂ فساد ہے، لیکن وہ کہتی ہے کہ میں اپنی قوم کی اصلاح کرتی ہوں اور اسی کی اصلاح و عروج کے لیے دوسری قوم کو اپنا غلام بناتی ہوں۔ پس جو شخص اس حکومت کے خلاف جہاد کرتا ہے وہ اس کو مفسد قرار دیتی ہے۔ لیکن تم کو معلوم ہے کہ خدا اس کو کیا کہتا ہے؟

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ فرعون نے مصر میں سرکشی کا بڑا ہی سر اٹھایا تھا۔
أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ اس نے رعایا کو کمزور کرنے کے لیے گروہ در گروہ
يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ إِنَّهُ کر دیا، ان میں سے ایک گروہ کو کمزور کرنا چاہتا تھا
كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ (قصص) وہ ان کے بچوں کو ذبح کرتا، ان کی عورتوں کو بے عصمتی کے لیے چھوڑ دیتا، بلاشبہ وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔

وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ: ۲۷) — کاٹ دیتے ہیں، اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہی لوگ ہیں کہ نامراد اور ناکام رہیں گے۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ (محمد: ۲۲) — تو پھر کیا تم چاہتے ہو کہ زمین میں فساد پھیلاؤ اور خدا کے قائم کیے ہوئے رشتوں کو قطع کرو؟

(۱۱) توحید اصلاح کا اصلی منبع ہے، اس لیے جو شخص مشرک ہے وہ سب سے بڑا مفسد ہے۔

وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ (آل عمران ۶۱، ۶۲) — خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اور بلاشبہ خدا ہی کی ذات ہے جو عزیز و حکیم ہے۔ پھر اگر تم اسی کے آگے نہیں جھکتے اور اپنی غیر انسانی پرستش گاہوں کو نہیں چھوڑتے ہو تو یقین کرو کہ اس کا نتیجہ تمہارے ہی آگے آئے گا اور خدا مفسدوں سے خوب واقف ہے۔

(۱۲) ایک پیمانہ عدل قائم ہو جاتا ہے، اور دنیا کے سامنے اصلاح کا دروازہ کھل جاتا ہے، مگر ایک تاجر اس پیمانے کے برابر نہیں دیتا، وہ فساد کرتا ہے، اور بعد اصلاح کے افساد کرتا ہے، اس لیے ایک پیغمبر پکارتا ہے

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (اعراف: ۸۵) — پیمانے اور ترازو کو پورا کر کے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو زمین میں اصلاح کے بعد فساد نہ پھیلاؤ۔

(۱۳) مذہب میں ثابت قدم رہنا اصلاح کی تکمیل ہے، اور تذبذب و ضعف اعتقاد فتنہ و فساد کی روح رواں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توحید کی تعلیم دی مگر انکو معلوم نہ تھا کہ یہ عقیدہ ابھی راسخ نہیں ہوا ہے، اس لیے شرک کا خوف ہے۔ پس حضرت ہارونؑ کو نصیحت کی:

وَقَالَ مُوسٰى لِأَخِيهِ هٰرُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي وَأَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيلَ الْمُفْسِدِينَ ○ (اعراف ۱۴۲)

موسٰی نے اپنے بھائی ہارون سے کہا: قوم کی ہدایت کے لیے میرے خلیفہ بن جاؤ۔ اصلاح کرو اور مفسدین کا اتباع نہ کرو جو بن کر پھر بگڑ جاتے ہیں۔

(۱۴) انفاق مال یعنی صدقہ و زکوٰۃ اور خیرات و بخشش سے دُنیا کی اصلاح ہوتی ہے اس لیے بُخل افساد ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِينَ فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُونَ (توبہ: ۱۷۶)

اور بعض ان میں سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا سے عہد کیا کہ اگر ہم کو مال و دولت عطا کرے گا تو ہم تیری راہ میں خرچ کریں گے، اور اس طرح صالحین میں سے ہو جائیں گے۔ پھر جب خدا نے اُن کو مال دیا تو محبتِ مال میں خدا کو بھول کر بُخل کرنے لگے۔

(۱۵) تمام اہل مذاہب اپنے اعمال و عقائد کو ذریعہ اصلاح و ارشاد سمجھ کے بجا لاتے ہیں، لیکن ہر وہ عمل جو تعلیماتِ اسلامیہ کے مخالف ہے، افساد ہے۔ گرفتاران عذاب پکارتے ہیں:

رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ (فاطر: ۳۷)

خدایا ہم کو جہنم سے نکال کہ ہم صالح اعمال بجا لائیں، وہ نہیں جن کو پہلے صالح کام سمجھ کر کرتے تھے بلکہ وہ جو فی الحقیقت اصلاح ہے۔

(۱۶) افساد بجائے خود افساد ہے، لیکن اس کے لیے گروہ بندی کرنا اور اجتماعی قوت پیدا کرنا دُوسرا افساد ہے، چُنانچہ خدا نے مُفسد گروہوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔

وَكَانَ فِي الْمَدِينَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُونَ شہر میں نو گروہ تھے جو زمین میں فساد پھیلاتے تھے،

فِی الْاَرْضِ وَلَا یُصْلِحُوْنَ   اور اصلاح نہیں کرتے تھے۔

ذوالقرنین سے لوگوں نے استدعا کی:

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَ مَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ (کہف ۹۴)   ان لوگوں نے کہا: اے ذوالقرنین یاجوج وماجوج کا گروہ زمین میں فساد کرتا ہے۔

ان کے علاوہ فساد کی اور بھی بے شمار جزئیات ہیں جو اصولاً انھیں کے تحت میں داخل ہو سکتے ہیں۔ خدا نے لفظ فساد کے ساتھ اگرچہ اِن کا ذکر نہیں کیا لیکن وہ سب سرچشمۂ فساد ہیں۔ شراب خواری، قمار بازی، سُود خواری وغیرہ کو خدا نے رجس یعنی ناپاکی کہا ہے، لیکن یہ بھی فساد کی مختلف تعبیریں ہیں، کیونکہ ہر گُناہ کی ترکیب فساد کے خمیر ہی سے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ابوابِ فساد کا جزئیاً و کلیاً قرآن میں ذکر کیا ہے، لیکن مفسدین کی کوئی خاص دنیوی علامت نہیں بتلائی جو ان کے اعمال کی عکسی تصویر یا اُن کا پرتو ہو، پس وہ صرف اپنے اعمال ہی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ فساد دراصل عدم محض و تیرگی خالص کا نام ہے، اور تاریکی میں صرف تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ البتہ افساد کے نتائج نہایت عبرت انگیز طریقے سے بیان فرمائے ہیں اور قرآن حکیم کا اصولی طرز بیان یہی ہے کہ وہ نتائج و خواص اعمال پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے اور اسی کے اندر اُن کے تمام اطراف نظر و بحث آجاتے ہیں۔

مگر نتائج افساد بھی کوئی وجودی چیز نہ تھی جس کو اجسام کی طرح دکھلایا جاتا، اِس لیے اس میں بھی تعداد و امتیاز کو ملحوظ نہیں رکھا ہے، بلکہ ایک ہی عبرت انگیز بربادی مختلف ہلاکتوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

(۲)

بعض جزئیات نتائج افساد

(۱) بنو اسرائیل نے احکام تورات کی مخالفت کی، اور خدا کی زمین میں عدل و اصلاح کی جگہ عصیان و فساد پھیلایا۔ بخت نصر اٹھا اور پامال کر دیا کیونکہ افساد کا آخری نتیجہ یہی ہے۔

وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُولٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا (بنی اسرائیل: ۴، ۵)

ہم نے بنی اسرائیل کے لیے کتاب میں فیصلہ کر دیا تھا کہ تم لوگ دو بار زمین میں فساد پھیلاؤ گے، اور بڑی ہی حد درجے کی سرکشی کرو گے سو جب پہلا عہد فساد کا آیا تو ہم نے تمھارے اوپر اپنے طاقتور و جنگ آزما بندے بھیج دئے، جنھوں نے تمام شہر کو اجاڑ دیا، اور خدا کا وعدہ پورا ہونے والا تھا۔

(۲) ایک قوم نے احسان کی ناشکری کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اونٹوں کا گلہ لوٹ لیا۔ چرواہوں کو قتل کر دیا۔ اسلام لاکر پھر مرتد ہو گئی۔ قرآن حکیم نے پھر اس افساد کی سزا مقرر کی، اور ان کو وہ دی گئی:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (مائدہ: ۳۳)

اُن لوگوں کی سزا جو خدا اور خدا کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہ ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا پھانسی پر لٹکا دیئے جائیں یا اُن کے ہاتھ پاؤں اُلٹے کاٹ ڈالے جائیں، یا جلا وطن کر دیئے جائیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ مصلحین کی جماعت کو بتدریج بڑھاتا ہے اور مفسدین کی جمعیت

کو بتدریج توڑتا گھٹاتا، اور پھر بالکل مٹا دیتا ہے، البتہ اس تدریج عروج و زوال کی رفتار مختلف ہوتی ہے:

وَاذْكُرُوٓا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ (اعراف: ۸۶)

اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے، تو خدا نے تم کو زیادہ کر دیا، اور ساتھ ہی دیکھو کہ مفسدین کا کیسا انجام ہوا، ادھر تم بڑھتے گئے اُدھر وہ گھٹتے گئے۔

(۴) فرعون نے خدا کی زمین میں استکبار کیا۔ ایک قوم کی آزادی سلب کر لی، اُس کی قوت کو برباد کر دیا، اُس کو غلاموں کی طرح اپنا محکوم رکھنا چاہا، یہ عمل فساد تھا، پس اس کا لازمی نتیجہ نکلا اور اُس کی تباہی کا وقت آگیا۔ آخری وقت آنکھ کھلی مگر اب وقت گذر چکا تھا:

آلْآنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنتَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ (یونس: ۹۱)

اے فرعون اب تو خدا کے آگے جھکنا چاہتا ہے، حالانکہ پہلے سرکشی کر چکا ہے اور زمین کے مفسدوں میں سے تیرا وجود بھی تھا!

(۵) اسی طرح اور بھی متعدد گذشتہ قومیں تھیں جن کا مایۂ خمیر فساد تھا، اللہ تعالٰے کے حکم سے کوئی زلزلہ کے ساتھ پیوند خاک ہو گئی:

وَأَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ جَاثِمِينَ ۝

جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کو عذاب الٰہی کی کڑک نے پکڑ لیا اور وہ اپنے گھروں میں بیٹھے کے بیٹھے ہی رہ گئے۔

کسی کو ہوا اپنے ساتھ اُڑا لے گئی:

فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي أَيَّامٍ

ہم نے اُن پر آندھی بھیجی اُن کی نامبارکی کے دنوں

تحصلت لنذيقهم عذاب الخزي في الحيوة الدنيا

ہیں۔ تاکہ ہم ان کو دنیا میں ذلت و نامرادی کا عذاب چکھادیں۔

کسی کو پانی اپنے ساتھ بہالے گیا:

حتى إذا جاء أمرنا وفار التنور

یہاں تک کہ جب ہمارے قانون عذاب کا وقت آگیا اور تنور نے جوش مارا۔

دیکھو، جزاء و سزا میں کس قدر مناسبت ہے! فساد عدم ہے یہ قومیں بھی معدوم ہو گئیں۔ افساد نتائج اصلاح کو مٹاتا ہے، یہ قومیں بھی مٹ گئیں

بعض جزئیات نتائج اصلاح

لیکن اعمال صالحہ کی حالت اعمال مفسدہ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ زندگی اور طاقت و صحت ہیں، اس لیے زندگی ہی کے نتائج کا اُن سے ظہور ہوتا ہے۔ وہ روشنی ہیں، اس لیے روشنی ہی کے تمام آثار و لوازم اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ سے زیادہ اعمال صالحہ کے نتائج و آثار کا ذکر کیا ہے:

إن الذين آمنوا وعملوا الصالحات يهديهم ربهم بإيمانهم تجري من تحتهم الأنهار في جنات النعيم (یونس: ۹)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور صالح اعمال اختیار کیے تو اللہ اُن کے ایمان کی روشنی کو اُن کے لیے شمع ہدایت بنا دیتا ہے اُن کے لیے نعمتوں کی جنت ہے اور اس میں نہروں کی روانی کا عیش نظارہ!

نیکی و بدی اور فساد و اصلاح میں یہی فرق ہے جس کو خدا نے اجمالاً بیان کیا ہے۔ ہر بدی کے اندر ترغیبات کا ایک ذخیرہ چھپا رہتا ہے جو نفس امارہ کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ لیکن نیکی نہایت سادہ صورت میں نمایاں ہوتی ہے کیونکہ وہ انسان کی فطرت اصلی

ہے، اور فطرت کا ہر جمال سادہ ہوتا ہے۔

(۱) مصلحین ہر شخص سے جھک کے ملتے ہیں، تکبر و غرور سے اُن کو نفرت ہوتی ہے، استکبار اُن سے چھو نہیں جاتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے صالح اعمال اختیار کیئے اور اپنے
وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ	پروردگار کے لیئے عاجزی کی، سو یہی لوگ اصحاب الجنۃ
الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (ہود: ۲۳)	ہیں جو اپنی حیاتِ بہشتی میں ہمیشہ شاد و خرم رہیں گے۔

"اخبات" یعنی عاجزی و تواضع اگرچہ خود عمل صالح میں داخل ہے اور اس لیے مستقل حیثیت سے اس کے ذکر کی ضرورت نہ تھی لیکن قرآن حکیم کا طرز خطاب یہ ہے کہ عام کے بعد خاص کو مستقلاً بیان کرتا ہے جس سے اس کا اہتمام شان واضح کرنا مقصود ہوتا ہے چنانچہ تم کو معلوم ہے کہ عام نمازوں کے بعد صلوٰۃ وسطیٰ کا ذکر مستقل طور پر کیا گیا حالانکہ احکام نماز میں نماز کی ہر شکل، ہر قسم، اور ہر طریق داخل تھا۔ اسی اصول کی بنا پر خدا نے اخبات کا ذکر بھی یہاں مستقلاً کیا ہے۔

(۲) مصلحین کے اعمال کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ عمل صالح کا بیج کبھی بھی گل سڑ نہیں سکتا وہ قطعاً پھلے گا اور قطعاً پھل لائے گا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، تو اُن کو ہمارا
اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا	قانون معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ہم عمل صالح کرنے والے
(کہف)	کے اجر اور مکافات کو کبھی ضائع نہیں کرتے۔

زنا سینکڑوں بچوں کو ضائع کر دیتا ہے، لیکن نکاح اپنے نتائج اپنی گود میں دیکھتا ہے۔

(۳) مصلحین میں ہمیشہ باہم محبت و یگانگی ہوتی ہے باہمی پھوٹ اور نفاق صاحب اصلاح گروہ میں نہیں ہو سکتا

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا۔ (مریم: ۹۶)

جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا سو قریب ہے کہ خدائے رحمان اُن کے لیے محبت کا دروازہ کھول دے گا۔

لیکن عمل فاسد کا نتیجہ صرف بُغض و عداوت ہے؛

فَاَغْرَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (مائدہ: ۱۴)

ہم نے قیامت تک کے لیے اقوام نصاریٰ کے درمیان بُغض و عداوت کی آگ بھڑکا دی۔

اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ۔

شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان شراب نوشی اور قمار بازی کے ذریعے بُغض و عداوت ڈال دے اور تم کو ذکر خدا اور نماز سے روک دے تو کیا تم باز نہیں آؤ گے؟

(۴) مصلحین کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ الٰہی کے قیام کے لیے اپنی تمام قوتوں کو وقف کر دیتے ہیں اور جب کبھی اُن پر ظلم کیا جاتا ہے تو پتھر اور گھاس کی طرح بے حس و حرکت نہیں پڑے رہتے بلکہ انسان کی طرح اُٹھتے ہیں اور ظالموں سے اُن کے ظلم کا بدلہ لیتے ہیں تاکہ ظالم کو سزا ملے اور عدل قائم ہو اس کے بارے میں ان کا ارادہ اور فعل دونوں یکساں ہوتے ہیں۔ جیسا کرتے ہیں ویسا ہی کر کے دکھا دیتے ہیں۔ اُن کی زندگی کی بُنیاد ارادہ نہیں بلکہ عمل ہوتا ہے۔

إِنَّمَا يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ (شعراء ۲۲۶ ۲۲۷) ان مفسدوں کا یہ حال ہے کہ زبان سے کہتے ہیں اُس کے خلاف عمل کرتے ہیں البتہ وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے، عمل صالح کیا، زیادہ سے زیادہ اللہ کے ذکر میں لگے رہے اور ظلم کا بدلہ لینے میں فتح مندی حاصل کی، بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا تھا اور وہ مظلوم تھے، سو ان کا حال ایسا نہیں ہے۔

لیکن اگر کسی نے ظالم کی حمایت کی، یا اُس کے ظلم پر خاموش رہا، یا خاموش رہنے کی ہدایت کی، تو وہ مُفسد ہے، کیونکہ وہ عمل فاسد کی اعانت کرتا ہے۔

(۵) مصلحین کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُن کا اعتماد صرف اللہ پر ہوتا ہے، پس وہ صبر کرتے ہیں اور صبر کے معنی کسی عمل اور کامیابی کی راہ میں مشکلوں کے برداشت کرنے اور قربانی کے ہیں۔

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ (عنکبوت: ۵۹) جن لوگوں نے صبر کیا اور جو خدا ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

(۶) مصلحین معاملات میں نہایت دیانت دار ہوتے ہیں، شرکت کے کاموں کو نہایت ایمانداری سے انجام دیتے ہیں، مُشترکہ چیزوں پر خود قابض نہیں ہو جاتے، بلکہ دُوسروں کو بھی مداخلت کا موقع دیتے ہیں۔

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِيْ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ (ص: ۲۴) اور بہت سے ساجھے کا کام کرنے والے ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں، مگر وُہ لوگ جو ایمان لائے اور عمل صالح کیا تو ان کا شیوہ عدل اور دیانت داری ہے، البتہ ایسے لوگ تھوڑے ہیں۔

(۷) خدا مصلحین کی دُعا قبول کرتا ہے، ان کی پکار کبھی مردود نہیں ہوتی، اور اُن

کے مال و دولت کو بڑھاتا ہے۔

وَیَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُھُمْ مِّنْ فَضْلِہٖ (شوریٰ: ۲۶)
اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا سو خدا اُن کی دُعا کو قبول کرتا ہے اور اُن کے کاموں کے پھل میں اپنے فضل سے برکت اور فراوانی بخشتا ہے۔

(۸) وہ کبھی ذلیل و رُسوا نہیں ہوتے، بلکہ ہمیشہ معزز اور بلند و ممتاز ہوتے ہیں۔ تمام دُنیا پر شرف و فضیلت صرف انہی کے لیے ہے۔ اشخاص کی حالت میں بھی اور جماعت کی حالت میں بھی:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ ھُمْ خَیْرُ الْبَرِیَّۃِ
جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا سو وہ دُنیا کی بہترین ہستی ہیں۔

اگر کوئی قوم دُنیا میں ذلیل ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عمل صالح نہیں کرتی:

(۹) وہ ہمیشہ حق اور قربانی کی باہم وصیّت کرتے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ پس تمام کائناتِ ارضی میں کامیابی اور فتح و مراد انہی کے لیے ہے، زندگی کی تمام مشکلات اور عمل انسانی کی تمام ناکامیوں سے وہ محفوظ ہو جاتے ہیں۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (والعصر: ۳)
زمانہ شاہد ہے کہ انسان کے لیے ناکامیابی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے، عمل صالح کیا، حق اور صبر کی باہم گر وصیّت کی تو اُن کے لیے ناکامی کی جگہ ہمیشہ کام و مراد کی زندگی ہوگی!

(۱۰) مصلحین کو ظلم و غصب حقوق کا کبھی ڈر نہیں ہوتا، کیونکہ وہ دلیری کے

ساتھ ظلم کا مقابلہ کرتے ہیں اور طاقت کے ساتھ اپنے حقوق کو محفوظ رکھتے ہیں:

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا (طٰہٰ: ۱۱۲)

اور جو شخص عمل صالح کرتا ہے اور ساتھ ہی اللہ پر یقین رکھتا ہے، سو اُس کے لیے ظلم اور غصب حق ہے کوئی خوف نہیں۔ نہ اُس پر ظلم ہو سکے گا اور نہ ہی اُس کا حق مارا جائے گا؛

(۱۱) مصلحین کی کوشش کبھی رائگاں نہیں جاتی:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ (انبیاء: ۹۴)

جو شخص عمل صالح کرتا ہے اور اللہ پر ایمان لاتا ہے تو اس کی کوشش کبھی ضائع نہ جائے گی، اور ہمارا قانون ایسا ہی ہے۔

اُن کو ناکامیابی پر ناکامیابی ہوتی ہے، مگر وہ اپنی دُھن میں لگے رہتے ہیں کیونکہ اُن کا نورِ ایمان بتاتا ہے کہ وہی ایک دن کامیاب ہوں گے۔ خدا کے پورے ہونے والے وعدے کی دستاویز اُن کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ ایک مقصدِ اعلیٰ کے لیے کوشش کرتے ہیں، اُن کو دھمکایا جاتا ہے مگر وہ نہیں ڈرتے۔ اُن کی مذمت کی جاتی ہے مگر وہ آزردہ خاطر نہیں ہوتے، اس لئے کہ وہ خدا کے وعدوں پر یقین رکھتے ہیں:

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔

جو شخص ایمان لایا اور اپنی اصلاح کی تو اُس کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ وہ کبھی غمگین ہوگا۔

(۱۲) عمل صالح انسان کے دل کو سنوارتا ہے، اِس لیے پچھلے گناہوں کا جو داغ دل میں ہوتا ہے، اس کو بھی مٹا دیتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ

اور جو لوگ ایمان لائے عمل صالح کیا، اور قرآن حکیم

اٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (محمد: ۲)
پر یقین کیا جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن کے لیے پیام حق ہے، سو وہ یقین کریں کہ اُن کے تمام گناہ جھڑ گئے اور اُن کے دل کو سنوار دیا گیا۔

اُن کے گناہوں کی ناکام زندگی کو نیکی کی سعید و کامیاب زندگی سے خدا بدل دیتا ہے:

اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (فرقان: ۷۰)
مگر جس شخص نے توبہ کی، ایمان لایا اور عمل صالح کیا، تو خدا اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور خدا بڑا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب تلوار لے کر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کرنے کے لیے چلے تھے، تو یہ تلوار کیسی مفسدانہ نظر آتی تھی؟ مگر اب اس کے جوہر میں ایمان و اصلاح کے ذرے چمکتے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیا یہ بدی کو نیکی کے ساتھ بدل دینا نہیں ہے؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا، يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (احزاب - ۷۱،۷۰)
مسلمانو! خدا سے ڈرو، ٹھیک اور پکی بات بولو، وہ تمہارے اعمال کو تمہارے لیے سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

(۱۴) مصلحین نہایت پاک و بامراد زندگی بسر کرتے ہیں:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ
جس عورت و مرد نے عمل صالح کیا اور وہ مومن بھی ہے تو ہم اس کو ایک پاک زندگی عطا کریں گے

لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (نحل)

اور اس کے کاموں میں ایسی قوت دے دیں گے کہ محنت سے زیادہ اُس کا پھل پائے گا۔

(۱۵) مصلحین کے اعمال کے نتائج کسی نہ کسی طرح اُن کی اولاد کو بھی مل جاتے ہیں، اور اگر نہیں ملتے تو یقین کرنا چاہیے کہ اُن کا باپ صالح نہ تھا۔ اگر کسی قوم کو حکومت نہیں ملتی تو اس کو ماننا چاہیے کہ اس کے اباؤ اجداد نے جو تاج سر پر رکھا تھا، اس میں اصلاح و فلاح کا موتی نہ تھا۔ حضرت موسیٰؑ جب ایک عالم الٰہی سے فیض یاب ہونے کے لیے نکلے اور وہ اُن کے ساتھ روانہ ہُوا تو راہ میں ایک شہر پڑا۔ شہر والے اتنے بداخلاق تھے کہ انھوں نے رہنے تک کی جگہ نہ دی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ کے ساتھی نے شہر کے باہر ایک پُرانی دیوار کی تعمیر شروع کر دی۔ حضرت موسیٰؑ نے اس تعمیر پر تعجب کیا تو انھوں نے یہ علت بتلائی کہ اس کے نیچے ایک صالح مرد و عورت کی دولت ہے جس کے وارث اُن کے یتیم بچے ہوں گے۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ (کہف: ۸۲)

دیوار شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ دفن تھا اور ان دونوں کا باپ صالح تھا، خدا نے چاہا کہ جب وہ جوان ہو جائیں تو اپنا خزانہ نکال لیں۔ اور ایسا نہ ہو کہ ان کے جوان ہونے سے پہلے ہی دیوار پُرانی ہو کر گر جائے۔

لیکن اس کے لیے اولاد کو بھی صالح ہونا چاہیے، ورنہ نتیجہ برعکس ہوگا حضرت موسیٰؑ کے ساتھی نے اسی سفر میں ایک لڑکے کو بھی قتل کر دیا کیونکہ برخلاف ان یتیم بچوں کے وہ مفسد ہونے والا تھا۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (کہف: ۷۹)

وہ لڑکا جس کو میں نے قتل کیا، سو اس کے باپ ماں مومن تھے مجھ کو خوف ہوا کہ طغیان وکفر کی وجہ سے کہیں سرکشی نہ کرے۔

(۱۶) صالحین کو ابدی شہرت حاصل ہوتی ہے، اور وہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ بقاء دوام، استمرار اسلام کے لازمی خواص ہیں:

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (شعراء: ۵۳)

خدایا مجے نبوت دے، اور مجھ کو صلحا میں داخل کر، اور آنے والی نسلوں میں میرا دائمی ذکر قائم رکھ!

(۱۷) صلحاء کا دل حرص وطمع سے خالی ہوتا ہے رشک وحسد سے اُن کو نفرت ہوتی ہے، وہ جزاء اُخروی کے آگے دنیوی مال ودولت کو ہیچ سمجھتے ہیں:

قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ قَارُوْنُ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا (قصص: ۸۰)

ان لوگوں نے جو دُنیوی زندگی کے طالب تھے، حسرت کھائی کہ کاش ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا ہے، وہ کیسا بڑا نصیب ور ہے! مگر جو لوگ صاحب علم وسعادت تھے انھوں نے کہا یہ کون سی چیز ہے جس کے لیے حسرت کر رہے ہو! صد افسوس تم پر! اصلی نعمت تو اللہ کا وہ بدلہ ہے جو صالحوں کو اُن کے اعمال کا ملتا ہے اور خدا کے مومن وصالح بندوں کے لئے وہی سب سے بڑی چیز ہے۔

(۱۸) بدی کا نتیجہ کتنا ہی دل خوش کن ہو مگر وہ محدود ہے، شراب کا نشہ ہمیشہ نہیں رہتا مگر حق کا متوالا ہمیشہ مست رہتا ہے۔ چوری سے دولت کثیرہ ہاتھ آسکتی

ہے، مگر اس کو گن سکتے ہیں۔ لیکن تجارت سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، اس کی کوئی خاص حد نہیں۔ ایک معمولی دکاندار اپنی زندگی خوش گذرانی کے ساتھ بسر کر دیتا ہے، اور اس کو کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا آیا اور کیا گیا؟ مگر چور روپے کو گن گن کے رکھ دیتا ہے، پھر بھی چند دنوں میں تمام دولت اڑ جاتی ہے۔ دل کا دکھ اور ضمیر کی بے چینی اس کے علاوہ ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ (سجدہ: ۵-۷) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا، اُن کے لیے غیر منقطع معاوضہ ہے۔

(۱۹) ہر چیز کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، اس لیے نیکی کے نتائج بھی اسی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں، لیکن تم نہیں جانتے کہ اس معراج روحانی کا زینہ کیا ہے؟ خدا خود بتلاتا ہے

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُهٗ (فاطر) خدا کی طرف کلماتِ طیبہ چڑھتے ہیں اور عمل صالح اس کو اونچا کر دیتا ہے۔ (اس آیت کی مزید تفسیر آگے آئے گی)

پس ہر نیک نیت کا، ہر سچی شہرت کا، ہر سچی کوشش کا زینہ صرف اعمال صالحہ ہیں، جو اُن کو خدا تک پہنچا دیتے ہیں۔

(۲۰) بیٹے کے ساتھ باپ کی محبت عمل صالح ہے۔ کیونکہ وہ بیٹے کے اعمال صالحہ کا نتیجہ ہوتی ہے اور کوئی عمل صالح نتیجہ بد پیدا نہیں کر سکتا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت تھی، کیونکہ وہ صالح تھے، اور اس لیے ان کو اپنے عمل صالح کا بہترین معاوضہ ملا تھا۔ لیکن اُن کے بھائیوں نے اس محبت کو جذب کرنا چاہا، مقصد نیک تھا، لیکن طریق اخذ و جذب مفسدانہ تھا، اس لیے ناکامیابی و ذلت دائمی نصیب ہوئی۔

اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یوسف کو قتل کر ڈالو یا اس کو کسی جگہ پھینک دو،

يَخۡلُ لَكُمۡ وَجۡهُ اَبِيۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِيۡنَ (یوسف: ۹) باپ کی محبت تمہاری طرف منتقل ہو جائے گی اور تم اُس کے بعد ایک صالح جماعت بن جاؤ گے۔

(۲۱) دُنیا کے بادشاہ ہمیشہ صلحاء ہوتے ہیں، متعدد غیر صالح قوموں نے اپنی سلطنت کھو دی، حالانکہ وہ ایک مدت تک وارث تخت و تاج رہ چکی تھیں۔ متعدد حکمران قومیں اعمال فاسدہ کے نشے میں چور رہیں۔ لیکن ان کو خدا کے ہاتھ کی گردش پر نگاہ رکھنی چاہیئے جو آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہے اور ایک مرتبہ دفعتاً چمک کر اُلٹ دیتا ہے، جعلنا عالیہا سافلہا

اِنَّ الۡاَرۡضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوۡنَ (انبیاء: ۱۰۵) زمین کے وارث صرف خدا کے صالح بندے ہوتے ہیں۔ فساد کے ساتھ حکومت باقی نہیں رہ سکتی۔

(۲۲) نیکی اور اصلاح کا ثمرہ پورا پورا ملتا ہے:

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيۡنَ (۱ آل عمران) جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کیا تو خدا اُن کو پورا معاوضہ دے گا، اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔

(۲۳) صلحاء تلاوت کرتے ہیں، خدا کا سجدہ بجالاتے ہیں۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے ہیں اور نیکی کی راہ میں سب سے آگے رہنا چاہتے ہیں۔

مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآٮِٕمَةٌ يَّتۡلُوۡنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيۡلِ وَهُمۡ يَسۡجُدُوۡنَ‏ يُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَيَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُسَارِعُوۡنَ فِى الۡخَيۡرٰتِؕ وَاُولٰٓٮِٕكَ مِنَ اور اہلِ کتاب میں ایک مستعد گروہ ہے۔ جو خدا کی آیات راتوں کو پڑھتا ہے اس حال میں کہ وہ سربسجود ہوتا ہے، خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لاتا ہے، نیکی کا حکم دیتا ہے، برائی سے روکتا ہے اور نیکی کی طرف تیزی سے بڑھتا ہے، وہی لوگ صلحاء

الصّٰلِحُوْنَ (آل عمران: ۱۰۸) میں سے ہیں۔

(۲۴) صلحاء کا ولی اور رفیق و مددگار صرف خدا ہوتا ہے، اس لیے وہ اسی سے رشتۂ مودّت جوڑتے ہیں:

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَ هُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ (اعراف) — میرا ولی صرف خدا ہے جس نے کتابیں نازل کیں اور وہ صالحوں کو دوست رکھتا ہے۔

(۲۵) برائی کتنی ہی پھیلی ہو، تاریکی کا بادل کتنا ہی غلیظ ہو، مگر صلحاء کا نورِ ایمان اُن کو برائیوں میں ملوث ہونے سے بچا لیتا ہے۔

وَ نَجَّیْنٰهُ مِنَ الْقَرْیَةِ الَّتِیْ کَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ اِنَّهُمْ کَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِیْنَ وَ اَدْخَلْنٰهُ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ (انبیاء: ۷۴) — اور ہم نے لوط کو اس گاؤں سے نجات دی جو بدکاریاں کرتا تھا، وہ نہایت بُری اور بدکار قوم تھی۔ اور ہم نے اُس کو اپنی رحمت میں داخل کیا کہ وہ صالحین میں سے تھا اور صالحین کی جگہ ہماری آغوشِ رحمت ہے۔

(۲۶) صلحاء مصیبت کے وقت مایوس نہیں ہوتے۔ ناشکری نہیں کرتے، اور خوش حالی میں غرور و فخر سے بھی بچتے ہیں کہ اُن کا ظرف وسیع ہوتا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَیَئُوْسٌ کَفُوْرٌ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَیَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّیِّاٰتُ عَنِّیْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ کَبِیْرٌ (ہود: ۱۲ تا ۱۴) — اور اگر ہم نے انسان کو اپنی رحمت کا مزہ چکھایا اور پھر اُس سے رحمت کو چھین لیا، تو وہ ناامید و ناشکرا ہو جاتا ہے، اور اگر نعمت کی لذت مصیبت کے بعد چکھائی، تو کہتا ہے کہ اب تو بُرائی میرے پاس سے چلی گئی، اور خوش ہو کر غرور سے اترانے لگتا ہے۔ البتہ ان لوگوں کا یہ حال نہیں جنھوں نے اعمالِ صالحہ

اختیار کیے، مشکلات میں صبر کیا، سو اُن کے لیے مغفرت اور بڑا معاوضہ ہے۔

(۲۹) وُہ لوگوں کی امانت ادا کرتے ہیں اور نہایت منصفانہ فیصلہ سُناتے ہیں۔ خدا نے صلحاء کے ذکر کے بعد ان کو عدل احکام کا حکم دیا ہے، کیونکہ عمل صالح کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا خدا تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ادا کرو، اور وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا جب فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ بِالْعَدْلِ۔

اب اعمال فاسدہ اور اعمال صالحہ کی فہرست تمہارے سامنے ہے، مصلحین اور مفسدین کی جماعت تمہارے آگے کھڑی ہے۔ نتائج پیش نظر ہیں مختلف حیثیتوں سے مقابلہ کرو، اعمال فاسدہ کس کثرت سے ہیں، اور کس قدر نقش و نگار کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں؟ لیکن نتائج کا حال مختلف ہے۔ اعمال فاسدہ کا صرف وہی ایک نتیجہ ہے جس کا عبرت ناک منظر گذشتہ قوموں کے افسانے پیش نظر کرتے ہیں۔ لیکن اعمال صالحہ کے نتائج کس کثرت سے ہیں، اور کس قدر مختلف ہیں؟ اعمال صالحہ اپنے خواص و نتائج و آثار سے کبھی الگ نہیں ہو سکتے، اس لیے خدا نے اعمال کے ساتھ اُن کے نتائج و آثار کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اعمال فاسدہ کے نتائج اُن سے جُدا بھی ہو جاتے ہیں، اس لیے کوئی مُفسد دفعتاً برباد نہیں ہو جاتا، وہ آہستہ آہستہ ہلاک ہوتا رہتا ہے۔ قرآن حکیم کی اصطلاح میں اُسی کا نام "امہال" ہے۔ یعنی بتدریج ہلاکت و تباہی کا قانون الٰہی۔

(۴)

الاختلاط والالتباس

تم نے اصلاح کو افساد سے، مصلحین کو مفسدین سے، نور کو ظلمت سے، پھول کو کانٹوں سے، الگ کرکے دیکھ لیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مفسدین و مصلحین کی یہ صفیں صرف کاغذ ہی کے صفحے پر علیحدہ قائم کی جا سکتی ہیں، یا سطحِ زمین پر بھی اُن کی بزم آرائی ہو سکتی ہے؟ چاند سے داغ صرف تصویر ہی میں جُدا کیا جا سکتا ہے، یا وہ آسمان پر بھی درحقیقت جُدا ہو سکتا ہے؟ قرآن حکیم اس کا جواب نفی میں دیتا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا — خدا نے نفسِ انسانی کو بدکاری اور پرہیزگاری دونوں کی راہیں دکھلا دیں۔

اصلاح و افساد اور خیر و شر کی یہی دونوں متضاد حالتیں ہیں، جو عملِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہیں، اس لیے افساد و اصلاح بھی ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے۔

بدقسمت لوگ تقدیر کی بڑی شکایت کرتے ہیں، لیکن یہ شکایت صحیح نہیں ہے، اُن کو اصل فطرت ہی کی شکایت کرنی چاہیے کہ اُس نے دُنیا میں بُرائی کا وجود کیوں رکھا؟ ہم اگرچہ اس کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن خدا کے معصوم بندوں نے اس قسم کی جرأت کی تھی:

إِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (البقرہ: ۲۸)

جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں، تو انہوں نے عرض کیا: کیا تو اس نوع کو خلیفہ بنائے گا جو زمین میں خونریزی کرے گی۔

خدا نے اعتراض کا جواب دیا، اُس کی تفصیل چند سطروں کے بعد آئے گی، لیکن حضرت

آدمؑ کے عمل نے تو جنت ہی میں فرشتوں کے اعتراض کی بظاہر تصدیق کر دی :

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (بقرہ: ۳۶)

پس ان دونوں کو شیطان نے راہ اطاعت سے ڈگمگایا اور اس عیش و آرام کے گھر میں جس میں وہ آباد تھے رہنے نہ دیا۔ ہم نے کہا کہ یہاں سے اترو، تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہے، اور تمہارے لیے اب زمین ہی میں ٹھکانا، اور ایک مدتِ مقررہ تک زندگی بسر کرنا ہے۔

لیکن تم کو صرف حضرت آدمؑ کے عمل ہی کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ اس کے دقیق نتائج پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ حضرت آدمؑ نے غلطی کی اور خود اپنا بنا بنایا گھر اجاڑا، لیکن تم نے دیکھا کہ اس افساد نے کیا اصلاح کی؟ اس تخریب نے کیا تعمیر کی؟ بغور دیکھو! اس تخریب نے ایک عالم کھڑا کر دیا، جس میں آدم کی اولاد چلتی پھرتی نظر آتی ہے، اس لیے حضرت آدمؑ کا یہ گناہ فرشتوں کے اعتراض کی تصدیق نہیں کرتا، بلکہ یہ اس کا علمی جواب ہے۔ انھوں نے کہا تھا کہ فساد سے دُنیا برباد ہو جائے گی، خدا نے اُن کو دکھا دیا کہ اصلاح و فساد لازم ملزوم ہیں، اس لیے اگر ایک گھر برباد ہو گا تو دوسرا آباد بھی ہو جائے گا۔

تم نے دیکھ لیا کہ تخلیق عالم کا سنگِ بُنیاد خیر و شر کی اجتماعی حالت کی سطح پر رکھا گیا ہے، اگر ترکیب نہ ہوتی تو تعمیر ناممکن تھی۔ اس لیے خیر و شر اور اصلاح و افساد نہ صرف اشخاص کا بلکہ مادۂ عالم کا مایۂ خمیر ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ مادۂ عالم کی ترکیب میں دونوں اجزاء برابر کی نسبت رکھتے ہیں یا اُن میں کوئی جُزو غالب بھی ہے۔ خدا کا فیض عام جواب دیتا ہے :

سَبَقَتْ رَحْمَتِي عَلَىٰ غَضَبِي۔ میری رحمت میرے غصّے پر سبقت لے گئی ہے۔

اس لیے خیر شر پر، اصلاح افساد پر غالب ہے۔ اور خدا نے فرشتوں کو یہی جواب دیا

ہے۔ فرشتوں کو حضرت آدم کے دامن پر صرف ایک فساد کا دھبہ نظر آیا تھا، جس کو خون کے چھینٹوں نے اور رنگین اور نمایاں کر دیا تھا، لیکن خدا نے کہا کہ ایک دھبہ ہزاروں نقش و نگار کے پردے میں چھپ جا سکتا ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (بقرہ: ۲۹)	اور آدمؑ کو اللہ نے کل چیزوں کے نام سکھا دیئے پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کر کے کہا! مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

فرشتوں کو ایک عیب ہزاروں ہنر کے سامنے ہیچ نظر آیا اس لیے خود اپنی غلطی کا اعتراف کیا،

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (بقرہ: ۳۰)	اُن لوگوں نے کہا: خدایا ہم کو تو صرف اُسی قدر علم ہے جتنا تو نے ہم کو سکھایا ہے بے شک تو ہی بڑا علم والا اور تیری دانائی سب سے بڑی دانائی ہے۔

پس خیر و شر کے اعمال کا یہ امتزاج علم و دانائی پر مبنی ہے

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا:

جس طرح مقدار و کمیت کے لحاظ سے خیر شر پر اور اصلاح افساد پر غالب ہے، اسی طرح کیفیت کے لحاظ سے بھی وہ شر و فساد سے زیادہ لطیف، نرم، رقیق اور تربیت پذیر ہے شر و فساد ایک کوئلہ ہے، جو پھونکنے کے بعد بھڑکتا ہے، لیکن خیر و صلاح بجلی کی رو ہے جو دفعتاً مشتعل ہو جاتی ہے اصلاح اصل فطرت صالحہ ہے اور افساد خارجی ضلالت کا نتیجہ، پس ضرورت صرف تزکیہ و تربیت کی ہے تاکہ زنگ دور ہو جائے اور آئینہ چمک اُٹھے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا وہ شخص کامیاب ہوا جس نے اس کا تزکیہ کیا، اور

وہ ناکامیاب رہا جس نے اس کو دفن کر دیا۔

اِس تربیت وتزکیہ کے بعد اِس کا قوام اِس قدر لطیف ہو جاتا ہے کہ:

یَکَادُ زَیْتُھَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ یَھْدِی اللّٰہُ لِنُوْرِہٖ مَنْ یَّشَآءُ (نور: ۳۵)

قریب ہے کہ اس کا تیل روشن ہو جائے اگرچہ اس میں آگ نہ لگائی جائے روشنی پر روشنی ہے۔ خدا اپنی روشنی کی طرف جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔

یہ وہی نور ہے جس کو حضرت موسیٰؑ نے شجر طور پر، حضرت ابراہیمؑ نے آفتاب و ماہتاب میں، ایک نبی اُمی نے غارِ حرا کی تاریکی میں دیکھا تھا۔ کیونکہ اس چراغ کا نور نہ تو چاند اور سورج کی روشنی میں ماند پڑ سکتا ہے نہ رات کی تاریکی اس پر پردہ ڈال سکتی ہے۔

الحد الفاصل

لیکن بایں ہمہ تاریکی موجود ہے، گو روشنی میں مدغم ہوگئی ہے۔ دُنیا میں بہت سے اندھے بھی ہیں، اس لیے وہ روشنی کو دیکھ نہیں سکتے۔ پس خیر و شر کے درمیان ایک حد فاصل کی ضرورت ہے کہ آبِ شیریں اور آبِ شور باہم ملنے نہ پائیں۔ خدا نے یہ حد بھی قائم کر دی ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ۔ (الرحمٰن)

میٹھے اور کھارے پانی کے دو دریا جو باہم مل گئے ہیں مگر ان کے درمیان ایک پردہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کی حد میں داخل نہیں ہو سکتا۔

جس وقت سے خیر و شر ہے، اسی وقت سے یہ حد بھی قائم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت آدمؑ کو بھی یہ حد بتلا دی گئی تھی:

وَلَا تَقْرَبَا ھٰذِہِ الشَّجَرَۃَ فَتَکُوْنَا

اور اس درخت کے قریب نہ پھٹکنا تاکہ زیادتی و

مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (بقر) انحراف کرنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

لیکن یہ حد محسوس چیز نہیں ہے، اس لیے شریعت نے اس کے امتیاز کا ذریعہ صرف ذوقِ صحیح کو قرار دیا ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کہ گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے" اور یہ ذوقی شہادت فطرتی چیز ہے۔ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اس کا دل دھڑکنے لگتا ہے، چہرہ متغیر ہو جاتا ہے، اسی کا نام نورِ ایمان ہے اور یہی خیر و شر کی حدِ فاصل کو قائم رکھ سکتا ہے۔

لیکن بایں ہمہ اختلاط عام ہے، شر مستطیر ہے، تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی ہے، اس لیے آدمی کا پاؤں پھسل جاتا ہے، اور وہ سرحد سے آگے قدم رکھ دیتا ہے، اس بنا پر، اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو جہنم میں نہ اترے رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (مریم) یہ تمہارے پروردگار کا قطعی فیصلہ ہے۔

لیکن خدا کی رحمت بڑی نقاد ہے، وہ جانتی ہے کہ دنیا میں زرِ خالص کا وجود بہت کم ہے اس لیے وہ اپنے دامن میں اس سونے کو بھی چھپا لیتی ہے جو خاک کے ذروں میں مخلوط ہے، جہنم کی آنچ بھی اسی لیے دکھائی گئی کہ سونا صرف آنچ ہی سے پاک ہو سکتا ہے:

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ اور دوسرے لوگ وہ ہیں کہ انھوں نے اپنے گناہ کا خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ اعتراف کیا، انھوں نے اچھے اور برے دونوں طرح سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ کے کام ملے جلے کیے تھے۔ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (توبہ ۱۳)

لیکن دنیا کی فضائے غیر محدود (التعادل والتوازن) میں ہزاروں سیارے گردش کر رہے ہیں، اور ہر ایک ، چاہتا ہے کہ دوسرے کی حد میں قدم رکھے لیے۔ اسی لیے اگر فطرت ان کو کسی مضبوط رسی میں جکڑ نہ دیتی تو وہ ایک دوسرے کی طرف بڑھتے بڑھ کے

ٹکراتے. اور نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ پس قدرتِ الٰہی ان کو کشش باہمی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھنے نہیں دیتی، اسی لیے سب کے سب اپنے اپنے طور پر ایک نہایت منظم، ایک نہایت باقاعدہ، ایک نہایت مرتب گردش کر رہے ہیں:

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ - (یٰس)
نہ سورج کو یہ حق ہے کہ چاند کو پالے، نہ رات دن کے آگے بڑھ سکتی ہے، سب ایک محور پر گردش کر رہے ہیں۔

انسان کا، انسان کے اعمال کا، انسان کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ٹکرانا چاہتے ہیں، اس لیے وحی الٰہی مذہب کی سنہری زنجیر سے اُن کی مطلق العنانیوں کو جکڑ دیتی ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا
سب کے سب خدا کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، کہ ایک دوسرے پر تعدی نہ کرنے پائے اور دنیا کی میزان عدل کا پلہ برابر رہے۔

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (حدید ۲۵)
ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل قطعیہ و براہین واضحہ کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان کو اتارا تاکہ عدل اور توازن قائم رہے۔

لیکن انسان کے جذبات، فطرت کی دوسری قوائے طبیعہ سے زیادہ ذکی الحس، زود اثر اور سریع الاشتعال ہیں۔ اس لیئے وہ باوجود اس جذب و کشش کے باہم ٹکرانا چاہتے ہیں، پس:

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ (مؤمنون ۷۱)
اگر حق بھی اُن کا اتباع کرتا، تو زمین و آسمان اور اُن کے رہنے والے برباد ہو جاتے۔

دُنیا کو اس تباہی سے بچانے کے لیے اس کو بجبر و اکراہ ایک مرکز پر لانے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی فطری ضرورت، جہاد، قصاص، اور تعزیر و عقوبت کی سنگِ بُنیاد ہے

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (حدید) اور ہم نے لوہا اُتارا کہ اس میں سلطان و نفوذ کی بڑی خوفناکی ہے اور لوگوں کے لیے فوائد بھی ہیں۔

قرآن حکیم نے جا بجا اسی توازن طبعی کے ذریعے قیام امن و سلام عام کی طرف اشارہ کیا ہے:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔ (بقرہ: ۲۵۲) اور اگر خدا بعض آدمیوں کے ظلم و زیادتی کو بعض کے ذریعے دفع نہ کراتا، تو زمین تباہ ہو جاتی۔ لیکن خدا تو دُنیا پر احسان کرنے والا ہے۔

بصائر و حکم

فلسفہ اجتماع اور جنگ

دُنیا اور دُنیا کی دلچسپیاں نہایت مختلف ہیں، ایک شخص فلسفہ سے دلچسپی رکھتا ہے، دوسرا شعر و سخن سے۔ ایک شخص حسنِ شوخ پر جان دیتا ہے، دوسرا سادہ اداؤں پر۔ ایک شخص مسجد میں شب بیداری کرتا ہے، دُوسرا کسی بُت خانے میں۔ ایک شخص شہر کی تنگ گلیوں میں ذوق نظارا کو پُورا کرتا ہے، دُوسرا کھُلے ہوئے میدانوں میں۔ غرض دُنیا کے اسی اختلاف مذاق نے ہر چیز کو با کار اور محبوب و مرغوب بنا دیا ہے اور اس کے دسترخوان کی کوئی غذا لو بے کار نہیں۔

لیکن دُنیا کی چیزوں میں صرف جنگ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہر شخص یکساں دلچسپی رکھتا ہے۔ زاہدانِ شب گداز بھی واقعات جنگ کو اسی ذوق و شوق سے سُنتے ہیں، جس طرح ایک ماہر سیاست میدانِ جنگ کی خبروں پر کان لگائے رکھتا ہے۔ ہیگ کانفرنس کا حال کتنے لوگوں کو معلوم ہے جو "صُلح" اور "امن" کے لیے قائم ہوئی تھی؟ لیکن موجودہ جنگ کے واقعات بچے بچے کی زبان پر ہیں اور کوئی فرد بشر نہیں جسے اس کی خونی

سرگذشتیں معلوم نہ ہوں!

پس زمانۂ "جنگ" میں تمام دُنیا متحد المذاق اور متحد الخیال ہو کر ایک نئی "جماعت" بن
جاتی ہے۔ زمانۂ جنگ میں دُنیا ایک انجمن ہو [illegible]
بار بار دہرائے جاتے ہیں، تمام انجمنوں کے چراغ بجھ جاتے ہیں، صرف لڑائی کی آگ
دُنیا کی مشترک انجمن کے لیے شمع ہوتی ہے۔ "جماعت" کے متعلق تم کو معلوم ہے کہ اُس
کے اعمال کسی ترتیب عقلی کے پابند نہیں ہوتے، جماعت صرف جذبات کی مخلوق
ہے۔ اس لیے یہ "کائناتِ مُنفعلۂ جنگ"، نہایت زُود اعتقاد، سریع الانفعال اور یکسر خیال
پرست ہوتی ہے۔ جنگ کے ساتھ ہی سریانِ خیال کی ایک برقی رو تمام دُنیا میں دوڑ
جاتی ہے۔ ایک بات جہاں کسی زبان سے نکلی، تمام دُنیا اسی کا کلمہ پڑھنے لگتی ہے۔

قوائے عقلیہ بالکل بے کار ہو جاتے ہیں، دُنیا پر صرف قوت غیر شاعرہ حکومت کرتی
ہے، ہر بات نہایت آسانی سے قبول کر لی جاتی ہے، اور درایت کا تمام دفتر پارینہ اُلٹ دیا
جاتا ہے۔ مُبالغہ ہر واقعہ کا لازمی جُزو ہو جاتا ہے۔ ہر واقعہ کی اصلی صورت مسخ کر دی جاتی
ہے۔ آج ایک فریق کی فتح پر اظہارِ مسرت کیا جاتا ہے تو کل دُوسرے فریق کی شجاعت کی
داد دی جاتی ہے، ایک جہاز پورے بیڑے کی طاقت حاصل کر لیتا ہے، ایک سپاہی لاکھوں افراد
سے زیادہ قوی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ لوگ اس سے اُسی قدر مرعوب ہو جاتے ہیں جس قدر
ایک عظیم الشان بحری طاقت اور ایک کثیر التعداد مجموعۂ افواج سے مرعوب ہو سکتے تھے۔

ساتھ ہی جماعت پر جو موثرات فرداً فرداً اثر ڈالتے تھے وہ مجموعی طور پر منظرِ عام پر
آ جاتے ہیں۔ دنیا کا سویا ہوا نفوذ و اقتدار دفعتاً بیدار ہو جاتا ہے۔ جنرل، سپہ سالار، فوج،
سلاطین اپنی زرق برق وردیوں کے ذریعے اپنے ذاتی اقتدار کا مجموعی اثر ڈالتے ہیں۔

مذہب و وطنیت کا جوش تازہ کیا جاتا ہے، مقرروں کی تقریریں میدانِ جنگ سے لے کر ایوانِ سلطنت تک میں آگ لگاتی رہتی ہیں۔ تجاربِ قدیمہ کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے کہ یہ قوم ہماری پُرانی دشمن ہے، ہمارے تہذیب و تمدن کو سینکڑوں بار برباد کیا ہے۔ بائیسکوپ میں فوجی نقل و حرکت کے تماشے دکھائے جاتے ہیں، قلعے فتح کئے جاتے ہیں، گرجوں میں آگ لگائی جاتی ہے۔ دار العلوم اور کتب خانے لوٹ لیے جاتے ہیں۔ قوم دیکھتی ہے کہ ہمارے علوم و فنون کا، ہماری دولت و ثروت کا، ہماری گذشتہ مجد و عظمت کا سرمایہ کیسے دفعتاً برباد ہوا جاتا ہے۔ قوم زخمیوں کا چہرہ نہیں دیکھتی، ان کے چہرے کا زخم دیکھتی ہے۔ تلوار کی چمک، توپ کی گرج، کمان کی چرچراہٹ، گھو[illegible]
جہازوں کے مستول، لہراتے ہوئے پرچم، رنگین جھنڈے، اور ان سب کا مجموعی ساحرانہ
[illegible] جو اس کا شیرازہ درہم برہم [illegible] پردے
میں چھپ جاتی ہے۔ تکرار و اعادہ جس کا جماعت پر سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا، ایک عام چیز ہو جاتی ہے۔ ہر شخص خواہش کرتا کہ باتوں کو دہراؤ، واقعات کا اعادہ کرو، ایک ہی خبر کو بار بار اغراق و شاعری کا اضافہ کر کر کے سُناتے رہو!

ایک ہی خبر مختلف اخباروں میں بار بار شائع ہوتی ہے اور دنیا اس کو مختلف زبانوں سے سُنتی ہے، سریانِ خیال کا معنوی اثر عام ہو جاتا ہے، اور پریس کی مادی طاقت اس میں اور بھی بال و پر لگا دیتی ہے۔

پس زمانۂ جنگ میں دُنیا جماعت کا ایک مشترکہ جولانگاہ بن جاتی ہے اور جماعت کے تمام موثرات نیچے سے، اُوپر سے، اندر سے، باہر سے، مشرق سے مغرب سے، شمال سے، جنوب سے، غرض ہر طرف سے اپنی پوری طاقت کے ساتھ عمل کرنے

گھٹتے ہیں اِس لیے تمام دنیا اندھی ہو جاتی ہے، خیرہ سر ہو جاتی ہے، بے راہ رو ہو جاتی ہے۔ افلاطون اپنے رواق میں افلاطون تھا مگر ان موثرات کے ہجوم میں وہ بھی مثل اور دل کے ایک انسان ہے۔ فلسفہ یہاں کیا کام دے سکتا ہے؟ وہ بھی اسی آبِ مدہوشی کا ایک گھونٹ پی کر عام حالت میں مدغم ہو جاتا ہے!!

اِس عالم میں دُنیا واقعات کو مسخ کر دیتی ہے، رات کو خواب میں ہوائی جہاز اُڑتا ہُوا دیکھتی ہے۔ تناقض واقعہ بن جاتا ہے۔ تمام متناقض واقعات کو وہ قبول کر لیتی ہے۔ "التوحید فی التثلیث والتثلیث فی التوحید" کی حقیقت اس کے لیے اتنا ہی ناقابلِ انکار ہو جاتی ہے، جتنا فلسفہ، تناقض و تضاد کے استحالہ کو بدیہی اور ناقابل انکار قرار دیتا تھا!

پس زمانۂ جنگ میں دُنیا ایک ظُلمت کدہ بن جاتی ہے جس میں تلوار کی چمک کے سوا دوسری روشنی نظر نہیں آتی اور اسی برق عالم سوز کی چمک نے دُنیا کو اندھا کر دیا ہے!

نامہ نگارانِ جنگ اور فلسفۂ اجتماع

اب بیسویں صدی میں نامہ نگارانِ جنگ نے مشعل دکھانا شروع کی ہے، لیکن ہم کو ان کے فن روایت کا بھی نقد کرنا چاہیے اور ان کی روایت کی حقیقت پر فلسفۂ اجتماع کی روشنی میں نظر ڈالنی چاہیے۔ بہت کم لوگ ہوں گے جنھوں نے اِس حیثیت سے اس موضوع کا مطالعہ کیا ہوگا

زمانۂ جنگ میں دُنیا ایک نئی جماعت بن جاتی ہے، اور اس کے تمام افراد کے معتقدات و خیالات، بلکہ کان، آنکھ، ہاتھ پاؤں، سب ایک ہو جاتے ہیں نامہ نگارانِ

جنگ بھی اسی دُنیا میں رہتے ہیں، اسی لیے وہ بھی اسی نئی متحدہ جماعت کا ایک جُزو ہوتے ہیں، کہیں باہر سے نہیں آتے۔ دُنیا پر جن چیزوں کا اثر پڑ سکتا ہے، وہی اُن پر بھی پڑتا ہے۔ بلکہ میدانِ جنگ کے مناظر تو نیں اور ان کا دائمی مطالعہ ان پر جنگ کا سب سے زیادہ اثر ڈالتا ہے۔

اگر دنیا اندھی ہے تو وہ بھی اندھے ہیں، اگر دُنیا بہری ہے تو وہ بھی بہرے ہیں۔ اس لیے وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اور جو کچھ سُنتے ہیں، وہ بھی اتنا ہی مشتبہ، قابلِ جرح اور غلط آمیز ہوتا ہے جتنا خود ہمارے مشاہدات و مرئیات۔

وَلَيْسَ الْمَسْئُوْلُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ

پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب دُنیا اندھی ہوتی ہے تو اندھوں سے بینائی مانگتی ہے؟ جب وہ بہری ہو جاتی ہے تو وہ بہروں سے سامعہ طلب کرتی ہے؟ جب محروم العقل ہو جاتی ہے تو اپنے ہی جیسے محروم العقل ہستیوں سے عقل و دانائی کا سوال کرتی ہے؟ جنگ کا عالمگیر اجتماعی اثر جماعت کے حواس و امیال پر پڑتا ہے، اس سے نامہ نگاروں اور مورخینِ عصر کو کیوں مستثنیٰ سمجھ لیا جائے؟ وہ بھی اسی جماعت کے افراد ہیں جو جنگ کے جماعتی ہیجان و انفجار جذبات کے سوا اور سب کچھ کھو چکی ہے، اور عقل و استدلال و مشاہدات عقلیہ سے یک قلم محروم ہے۔ وُہ نہ تو آسمان سے اُترے، اور نہ زمین ہی شق ہوئی تاکہ نامہ نگاروں کی ایک صف اس کے اندر سے اُبھرتی۔ وہ جماعت ہی کی اندھی نظر، جماعت ہی کے بہرے کان، جماعت ہی کے محرومُ العقل دماغ کو ساتھ لے کر اس کوہ فراموشی کے عین دامنوں میں چلے گئے، جس کا ساحرانہ اثر ہزار ہا میلوں اور فرسخوں کے فاصلے سے تمام دُنیا کو

مسحور کر رہا تھا۔ پس جس سمندر کی لہریں دُور کی بستیوں کو پیام ہلاکت دے رہی تھیں وہ عین اس کے اندر ڈوب گئے، جس آتش فشاں پہاڑ کی باراں سنگی دُور دُور کی آبادیوں کے لیے بارش ہلاکت تھی، وہ عین اس کے کناروں میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ اب وہ صرف اَوروں جیسے ایک معطل ددماغ ہیں، بلکہ اَوروں سے زیادہ کھوے ہوئے اَوروں سے زیادہ مدہوش وحواس فروش!

کہا جاتا ہے کہ اُن کی خبریں یقینی مشاہدات کا نتیجہ ہوتی ہیں، لیکن اوپر کی مثالوں اور عام بیانات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جماعت کا مشاہدہ بالکل غلط ہوتا ہے، اور وہ بھی اسی جماعت کے زیادہ غلط بین افراد ہیں۔

نامہ نگارانِ جنگ کو جو خصوصیت تمام دُنیا سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص جماعت ہیں، جن کو عینی گواہوں کی جماعت کہنا چاہیئے۔ اس لیے ہم کو گواہوں کی خصوصیات نفسانیہ پر بحث کرنا چاہیے۔ تاکہ اُن کی قوت شہادت واضح ہو سکے۔

شہادت کے لیے عموماً تعلیم یافتہ اور روشن خیال لوگ منتخب کیے جاتے ہیں۔ لیکن جماعت تو عقل سے خالی ہوتی ہے۔ اس لیے اگرچہ وہ لوگ شخصی حالتوں میں بہت بڑے دانا وہوشمند تھے لیکن جماعت میں داخل ہو کر انھوں نے بھی اپنے قوائے عقلیہ کو بالکل کھو دیا ہے اور اُن کی شخصیت ایک عام فرد کی سی ہو گئی ہے۔

عقل ایک روشنی ہے، لیکن روشنی ہر جگہ کام نہیں دیتی۔ سورج کو ہر شخص یکساں طور پر دیکھتا ہے، لیکن یکساں طور پر اس کی روشنی سے کام نہیں لیا جاتا۔ اس لیے شاہد کتنا ہی بڑا فلسفی ہو، لیکن جب وہ کسی عام واقعہ کے متعلق شہادت دے گا تو اس کی حیثیت ایک معمولی کے علم ویقین سے زیادہ نہ ہو گی۔ جس آنکھ اور کان

سے ایک مزدور اس واقعہ کو دیکھتا ہے اور سُنتا ہے، اسی کان سے سُن کر اسی آنکھ سے دیکھ کر، ارسطو بھی شہادت کے کٹہرے میں کھڑا ہوگا۔ اگر وہ حالتِ شہادت میں عقلی اصول پر واقعات کا نقد کرے گا تو جج اُسے اپنے فرائض کی توہین سمجھے گا اور سپاہی کو حکم دے گا کہ ارسطو کو توہین عدالت کی پاداش میں سزا دے۔

۱۸۴۵ء میں فرانس کے عام سیاسی معاملات میں شہادت لینے کے لیے مخصوص لوگ منتخب کیے جاتے تھے، مدرسین، اہل منصب، مصنف اور انشا پرداز کی شہادتوں سے عام ملکی مسائل کا فیصلہ کیا جاتا تھا، لیکن اب تاجر، زمیندار معمولی ملازمین اور حرفت پیشہ لوگوں کی شہادت لی جاتی ہے، جب شہادتوں کا مقابلہ کیا گیا تو دُنیا نے حیرت سے دیکھا کہ نتائج میں کوئی فرق نہیں۔ چنانچہ بڑے، بڑے ججوں نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ ایک جج اپنے یادداشت میں لکھتا ہے:۔

اب شاہدوں کے انتخاب کا حق میونسپلٹی کو حاصل ہوگیا ہے، اور میونسپلٹی ہی سیاسی اغراض کے لحاظ سے ایک شہادت کو رد اور دوسرے کو قبول کرتی ہے میونسپلٹی کے تعلق سے معمولی درجے کے تاجروں کی شہادت قبول کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بڑے بڑے عہدہ دار شاہد بنائے جاتے تھے لیکن گواہوں کی حالت میں اس سے کوئی محسوس فرق پیدا نہیں ہوا۔ نتائج جیسے پہلے تھے، ویسے ہی اب ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ججمنٹ تمام پیشوں کا عطر اور خلاصہ ہے۔ جو تعلیم یافتہ جماعت، شہادت کے کٹہرے میں کھڑی ہوتی ہے، اس کو اجتہاداً عام پیشہ ور لوگوں کے تجارب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے نتیجہ وہی ہوتا ہے جو دوسری صورت میں تھا۔ روایت کے لحاظ سے ادنیٰ درجے کے لوگوں میں بھی ثقات کی کمی نہیں،

اس لیے بصارت کے معاملات میں ہر شخص جج کو یکساں نتیجہ پر پہنچا سکتا ہے۔
شاہدوں پر بھی واقعات خارجیہ کا اُسی طرح اثر پڑتا ہے، جس طرح ایک عامی پر پڑتا ہے۔ ایک جج کہتا ہے:
'ایک شگفتہ رو عورت مُسکرا کر گواہوں کی سراسیمگی کو اپنا فریفتہ بنا لے سکتی ہے'۔
ایک بیرسٹر کا قول ہے۔
"ایک دُودھ پلانے والی عورت، اور چند غریب یتیم بچوں کی مصیبت گواہوں سے بلا تامل جھوٹ بلوا سکتی ہے"۔
اگر ایک شخص کوئی پولیٹیکل یا تمدنی جُرم کرتا ہے اور گواہ سمجھتا ہے کہ مُلک و قوم پر اس کا عام اثر ہوگا تو وہ اس کے خلاف نہایت بیدار دانہ شہادت دے گا۔ لیکن اگر ایک شخص کسی لڑکی کو بھگا لے گیا ہے تو شاہد کی شہادت میں بے رحمی کی وہ جھلک نظر نہ آئے گی۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اِس جُرم کا کوئی عام قومی اور پبلک اثر نہیں پڑے گا۔
گواہ اکثر نفوذ و اقتدار سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں۔ ایک دولت مند خطاب یافتہ اور مشہور آدمی کے خلاف اگر کسی تعلیم یافتہ شخص کو شہادت دینی ہو تو اس کی حالت اُس سے بالکل مُختلف ہوگی۔ جب وہ چور کے خلاف شہادت دے گا۔ ایک بیرسٹر کہتا ہے۔
"وکلاء کو چاہیئے کہ گواہوں کے حرکات و اشارات کو بار بار دیکھیں۔ جس طرح ایک عام آدمی سے خطاب کیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح اس سے بھی خطاب کرنا چاہیئے۔ شاہد پر جو خارجی اثر پڑ رہا ہے، اس سے پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔
پس نامہ نگاروں کی جماعت بھی عام افراد کی طرح ہر خبر سے متاثر ہوتی ہے

اگر جرمن قوم کا نامہ نگار ہے تو اس کو ہمیشہ جرمن جھنڈا ہی بلند نظر آئے گا جرمنی کے مظالم کی داستان کتنی ہی دردانگیز ہو، جرمن نامہ نگار اس کی کوئی بہتر تاویل کرے گا، مگر فرانس کا نامہ نگار اس میں اصلیت سے زیادہ مبالغہ کی رنگ آمیزی کرے گا۔ غرض کہ دُنیا کی قدیم و جدید تاریخ پر اعتبار کرنے کا ہمارے پاس کوئی صحیح ذریعہ نہیں۔ قدیم عہد ظلمت کو جدید دَورِ برق دکہربائیت نے کچھ زیادہ روشن نہیں کیا۔ دُنیا جس طرح پہلے تاریک تھی اب بھی ہے ۔
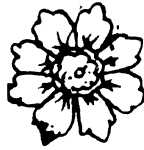
جنگ کا اثر

فنِ روایت پر

(۱)

دُنیا درحقیقت مؤثرات کی ایک رزم گاہ ہے، جس میں ایک قوت دُوسری قوت سے ٹکرا کر فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کا ایک مستقل سلسلہ جاری رکھتی ہے۔ تصادم قوتوں کا یہ عام قانون ہے لیکن کیا ایک دُشمن دوسرے دُشمن سے نرمی کے ساتھ بھی بغل گیر ہو سکتا ہے؟

دُنیا کا مادہ اِس فلسفیانہ سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔

مادۂ عالم قوت کے بَل پر قائم ہے۔ قوت کسی سے جُھک کے مِلنا نہیں چاہتی۔ وہ ہمیشہ اُبھرتی ہے اور اُبھر کے دُوسری قوت سے ٹکراتی ہے۔ اس کشمکش و مقاومت کا فیصلہ بھی قوت ہی کی شدت و ضعف پر ہوتا ہے۔ اگر وہ ضعیف ہے تو خود چُور چُور ہو جاتی ہے۔ قوی ہے تو اپنے حریف کو پاش پاش کر دیتی ہے۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میزان عمل دونوں کے توازن کو مساویانہ

حیثیت سے قائم رکھتا ہے۔ اِس حالت میں وہ ایک قوت سے کچھ لے لیتا ہے اور دوسرے کو کچھ دے دیتا ہے۔ پس صُلح بھی جنگ ہی کے سلسلے میں داخل ہے۔ بلکہ جنگ کی ایک خاص شکل کا نام ہے۔ اِسلام چونکہ دُنیا کے تمام مواد و قویٰ کے توازن کو صحت و عدالت کے ساتھ قائم کر دینے کے لیے آیا تھا اس لیے اس نے جنگ کی اسی مخصوص شکل کو منتخب کر لیا:

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَہُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ ذُوْفَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۲:۲۵۳) اور اگر خدا ایک جماعت کو دوسری جماعت کی مدافعت کی قوت نہ دیتا تو دُنیا برباد ہو جاتی لیکن خدا تو تمام نظامِ عالم کو اس کی تمام احتیاجات و ضروریات بخشنے والا ہے، اس لیے اس نے تمام دُنیا پر قوت کو تقسیم کر دیا۔

چنانچہ شریعت الٰہیہ نے دُنیا کی میزانِ عدل کو جس نظام پر قائم رکھا ہے، وہ قوت ہی کی مساویانہ تقسیم کے بل پر قائم ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَہُمْ بِبَعْضٍ لَّہُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْہَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا (۲۲:۴۰) اگر خدا ایک جماعت کو دوسری جماعت کی مدافعت کی قوت نہ دیتا تو حق اور صداقت کا دُنیا میں کوئی محافظ نہ رہتا اور خدا پرستی مظلوم ہو کر فنا ہو جاتی۔ شریعت کی تعلیم گاہیں اور معبد منہدم ہو جاتے، صلوٰۃ الٰہی کا ادا کرنا جرم بن جاتا اور وہ تمام مسجدیں اُجڑ جاتیں جن میں خدائے واحد کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے!

جہادِ اسلامی کی حقیقت اِسی صُلح پرور جنگ کی ایک زندہ مثال ہے، لیکن اس وقت ہم کو جنگ کے ان نتائج سے بحث نہیں جو دنیا کے توازن کو قائم رکھتے ہیں، بلکہ صرف تصادم قواء کے عام اثرات سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

دُنیا کی ہر قوت اگرچہ ٹکرا کر کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور پیدا کرتی ہے، لیکن تصادم قواء کا سب سے زیادہ ہیبت انگیز منظر جنگ کی صورت میں دُنیا کے سامنے نمایاں ہوتا ہے۔ دُنیا کی ہر مادی قوت اگرچہ انفرادی حیثیت سے ہمیشہ سرگرم کارزار رہتی ہے لیکن اجتماع و تعاون (یعنی باہم جمع ہو کر ایک دوسرے کی مدد کرنا) صرف انسان ہی کا مخصوص جوہر ہے اور اسی مدنی خصوصیت کی بنا پر اس نے تمام دوسری قوتوں کو زیر اثر کر لیا ہے۔ دُنیا کے معرکۂ کارزار میں بھی اس کی یہ اجتماعی شان نظر آتی ہے۔ اس کے ذریعے وہ دُنیا کے سامنے اِس اجتماعی قوت کی ایک عام نمائش کر سکتا ہے۔ جو کیف وکم دونوں میں تمام دوسری قوتوں کا ایک مرکب سمجھی گئی ہے۔ اِس لیے اس کے تصادم کا مجموعی اثر بھی ہر قوت سے شدید تر اور مختلف ہوتا ہے۔ دوسری قوتیں صرف ایک مادہ یا ایک قوت پر اثر ڈال سکتی ہیں، لیکن انسانی جنگ کا دائرہ اثر غیر محدود ہوتا ہے۔ وہ عقائد پر، اخلاق پر، لٹریچر پر، مذہب پر، تمدن پر، جان پر، مال پر، غرض عالم ہستی کے ایک ایک ذرے پر اثر ڈالتی ہے، اور اس اثر کو اور اس کے مسلسل نتائج و عواقب کو ایک مستقل یادگار کی صورت میں ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔

لیکن دُنیا کی نگاہیں مادہ پرست ہیں اس لیے وہ جان کی مرثیہ خوانی میں اپنی دوسری متاعوں کو بھول جاتی ہیں۔ البتہ ایک تیز حقیقت بین نگاہ خون کی رنگین چادروں سے گذر کر جب عقائد، اخلاق، لٹریچر، تمدن، غرض ہر چیز کو ٹٹولتی ہے تو اس کو اس قتل عام میں رنج و مسرت، دونوں کے سامان ہاتھ آتے ہیں۔ وہ دیکھتی ہے کہ جنگ نے مفتوح قوم کے عقائد، مذہب، اخلاق، لٹریچر اور تمدن کو بالکل برباد کر دیا اور اس ماتم کبریٰ پر ایک آنکھ آنسو بہانا چاہتی ہے، لیکن دوسری آنکھ

اس پر رانسی ہیں ہوتی کہ اصلی خزانہ ابھی باقی ہے۔اس کو اگرچہ مفتوح قوم نے کھو دیا ہے لیکن دُنیا نے نہیں کھویا۔ وہ دُنیا ہی میں ہے، البتہ مفتوح قوم کی جیب سے نکل کر فاتح کے دامن میں منتقل ہو گئی ہے۔ ولنعم ماقیل

زغارت چمنت بر بہار تنہاست
کہ گل بدامن ما دستہ دستہ می آید

لیکن فن روایت پر جنگ کا اثر اس سلسلے سے بالکل مختلف پڑتا ہے۔ ہر جنگ ایک سلسلۂ روایت پیدا کر دیتی ہے جو مفتوح کے دماغ سے نکل کر فاتح کی جیب میں نہیں جاتا بلکہ دونوں کا سرمایہ انھیں کے پاس رہ جاتا ہے، اس لیے بظاہر فن روایت کو جنگ کے عام اثر سے بالکل محفوظ رہنا چاہیئے۔

(۲)

لیکن کیا درحقیقت اس کا دامن خون کے دھبوں سے بالکل پاک ہے؟ اصلی ماتم اِسی سوال سے شروع ہوتا ہے۔

امن وصُلح کے زمانے میں ہر چیز سے خون کا دھبہ چھُڑا دیا جاتا ہے، لیکن صرف تاریخ ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا دامن مبالغہ آمیز اور مصنوعی طریقے پر خون سے رنگین کیا جاتا ہے۔ جنگ تاریخ کے چہرہ کو سب سے زیادہ زخمی کر دیتا ہے جنگ کا جو اثر، مذہب، اخلاق، تمدن اور لٹریچر وغیرہ پر پڑتا ہے، وہ درحقیقت قوت کے ایک مخصوص وصف اِمتیازی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قوت کبھی دب کر رہنا نہیں چاہتی، وُہ ہمیشہ دوسروں کو دباتی رہتی ہے۔ قوت کی اِس نمود نے انسان کو بالطبع کبر پسند بنا دیا ہے، اس لیے وہ اپنے کارناموں کو ہمیشہ دُنیا کے سامنے ایک نئے

آب و رنگ کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ جنگ اپنے پاس بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ جنگ میں اظہار فخر و غرور کے دو متضاد مواقع عموماً پیش آتے ہیں اور دونوں جگہ مبالغہ آفرینی و فریب کاری مختلف شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔

جنگ کا ایک منظر تو وہ ہوتا ہے، جب ایک فریق کی تعداد نہایت قلیل ہوتی ہے لیکن دوسری طرف سے فوج کا ایک ٹڈی دَل اُمنڈتا ہوا چلتا ہے۔ اِس صورت میں اگر یہ کثرت، قلت پر غالب آجائے تو اُس کے فتح و ظفر کی داستان کسی مزید تعلیل و توجیہہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ اس وقت صرف یہ کہہ دینا کافی ہوتا ہے کہ تنکا سیلاب کے مقابلے میں کیونکر ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے، ایک تنہا قوت بہت سی عظیم الشان قوتوں پر غالب آجاتی ہے:

وَكَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً (۲: ۲۴۹) کتنی ہی کم تعداد و کم قوت جماعتیں ہیں جو اپنے سے بڑی بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں، جب کہ اللہ کی نصرت نے اُن کا ساتھ دیا۔

تو اس وقت دُنیا کے اس اصول موضوعہ کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، اور اِس غیر متوقع کامیابی کے پیدا کردہ عمل و اسباب بنانے پڑتے ہیں، یہ کام درحقیقت فلسفہ کا تھا، لیکن وہ اپنے فرائض صرف رواق افلاطون کے ایک گوشے ہی میں ادا کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ سوال میدانِ جنگ میں کیا گیا ہے اِس لیئے قوت ہی اس کا جواب دیتی ہے اور اپنی شجاعت اور دشمن کی بُزدلی کی مبالغہ آمیز داستان سرائی کرنے لگتی ہے۔ یہیں سے فن تاریخ کا وہ زخم نمایاں ہونے لگتا ہے جو آگے چل کر اس کے جسم تحقیقت و واقعیت کا ناسور بن جاتا ہے۔

(۳)

اشخاص کی شجاعت کے کارنامے اس سے بھی زیادہ مبالغہ آمیز صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

عرب میں ایک بہادر شخص سباع (درندہ جانور) کے لقب سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ یہ لفظ کسی تاریخی کارنامۂ شجاعت پر دلالت کرتا تھا۔ اس لیے آگے چل کر اس کی وجہ تسمیہ کے متعلق ایک تاریخی بحث پیدا ہو گئی۔ فن روایت نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ وہ اس قدر بہادر تھا کہ جب اُس کی بکریوں کے گلے میں شیر یا بھیڑیا آجاتا تھا تو اس زور سے ڈانٹتا تھا کہ اُن کا کلیجہ پھٹ جاتا تھا اور وہیں تڑپ کر مر جاتے تھے کیونکہ شیر وغیرہ کو عربی میں سبع کہتے ہیں اس لیے اس شجاعت کی یادگار میں اہل عرب نے اس کو "سباع" کا خطاب دے دیا۔

لیکن اس روایت پر یہ بحث کی گئی کہ عموماً بکریاں نہایت کمزور اور ضعیف القلب ہوتی ہیں، یہی کہ بزدلی کا ماخذ لغوی بھی وہی ہیں، اس بناء پر اگر اس شخص کی مہیب آواز سے بھیڑیے یا شیر کا دل پھٹ جاتا تھا تو بکریاں اُس کے اثر سے کیونکر بچ جاتی تھیں؟ اس کا جواب یہ دیا گیا کہ اس کی قلب افگن آواز شیر کے لیے بالکل ایک نئی آواز ہوتی تھی اس لیے اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا لیکن بکریاں اس کی عادی ہو گئی تھیں۔ عادت فطرت کو بدل دیتی ہے "یہ جواب گو صحیح بنا لیا جائے تاہم ظاہر ہے کہ اس روایت میں بہت کچھ مبالغہ کا رنگ بھر گیا اور اصلیت سے قطعاً بعید ہے۔

(۴)

لیکن اظہار شجاعت کا ایک دوسرا شریفانہ طریقہ ہے جس کو اہل عرب کی فطرت پسند

طبیعت نے ایجاد کیا تھا۔ مفتوح قوم یا مغلوب شخص کی بزدلی کے اظہار سے اگرچہ فتح و ظفر کی فلسفیانہ توجیہہ و تعلیل ہو جاتی ہے، لیکن اخلاقی حیثیت سے ایک مُردہ قوم یا بزدل شخص پر غالب آجانا فاتح کے لیے کوئی قابلِ فخر چیز نہیں۔ اس بناء پر اہلِ عرب نے اپنی شجاعت کے اظہار کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ پہلے دشمن کی بہادری کی نہایت فیاضی کے ساتھ داد دیتے تھے، پھر آخر میں صرف اتنا کہہ دیتے تھے کہ "ہم نے ایسے غیور، کریم النفس، اور دلیر شخص کو میدانِ جنگ میں پچھاڑ دیا"۔ اس مدح سے درحقیقت اپنی ہی شجاعت کا اظہار مقصود ہوتا تھا۔

دشمن کے فضائل و مناقب کے اظہار و اعتراف میں اگرچہ بہت زیادہ فیاضی نہیں کی جاتی تھی، تاہم چونکہ اس کا ثمرۂ فتح بھی فاتح ہی کو ملتا تھا، اِس لیے یہ طریقہ بھی غلو و اغراق سے خالی نہ تھا۔ چنانچہ اہلِ عرب نے بھی اس کمزوری کو محسوس کیا اور افراط و تفریط کے ان دونوں دائروں سے الگ ہو کر قصیدہ کی ایک مستقل قسم پیدا کی جس کو "منصفات" کہتے ہیں۔ ان قصائد میں انصاف و صداقت کے ساتھ فریقین کے کارنامے بیان کر دئے جاتے تھے، لیکن دُنیا میں صداقت کے ساتھ انصاف کبریتِ احمر سے بھی زیادہ نایاب ہے۔ اس لیے اگرچہ ابو تمام نے حماسہ کے انتخاب میں عرب کے تمام مجموعۂ اشعار کو کنگھال ڈالا، لیکن اس کو اس سلسلے میں صرف دو ہی قصیدے ہاتھ آئے۔ قصیدے کی اس مستقل صنف سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا جنگی لٹریچر باوجود واقعیت پسندی کے مبالغہ و غلو سے خالی نہ تھا۔

(۵)

جن لڑائیوں میں فوج کی تعداد کم ہوتی ہے، اُن کی قوت میں اعانتِ غیبی کے بغیر

واقعی ذریعے سے بھی اضافہ کیا جاتا ہے، اور قدیم زمانے کی مذہبی جنگوں کی تاریخ کلیہ ایک دلچسپ باب ہے جو مبالغہ و غلو کے ساتھ انسان کی عجائب پسندی اور زود اعتقادی کا کافی ذخیرہ اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ دُنیا کی عام مذہبی تاریخوں میں اس قسم کے واقعات بکثرت مل سکتے ہیں۔ چونکہ فتح و ظفر کا فیصلہ کثرت ہی پر کیا جاتا ہے، اس لیے جماعت کی تعداد ہمیشہ مبالغہ آمیز طریقے سے غیر محدود دکھائی جاتی ہے۔ شجاعت گو ایک رُوحانی جوہر ہے، لیکن وہ دُنیا کو محسوس شکل میں دکھائی نہیں جاسکتی۔ صرف اس کے نتائج ہی نظر آسکتے ہیں، لیکن دُنیا نتائج پر کب نظر رکھتی ہے؟ البتہ فوجوں کے ٹڈی دَل کا نظارہ ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے اس لیے غیر محقق مذہبی تاریخیں عموماً دُنیا کو اسی کا منظر دکھاتی ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اس پر ایک عمدہ نظر ڈالی ہے:

وقد نجد الکافۃ من اھل العصر اذا افاضوا فی الحدیث عن عساکر الدول التی لعھدھم او قریبا منہ وتفاوضوا فی الاخبار عن جیوش المسلمین او النصاری او اخذوا فی احصاء اموال الجبایات وخراج السلطان ونفقات المترفین وبضائع الاغنیاء الموسرین توغلوا فی العدد وتجاوزوا حدود العوائد وطاوعوا وساوس الاغراب فاذا استکشف اصحاب

اور ہمارے تمام ہم عصر مورخین جب اپنے زمانے یا اپنے قریب کے زمانے کے بادشاہوں کی فوجوں کے متعلق روایت کرتے ہیں، یا مسلمانوں اور نصاریٰ کی فوجوں کے اجتماع کا ذکر کرتے ہیں، یا مال گذاری اور خراج کی رقوم اور دولت مند لوگوں کے مصارف اور متمول لوگوں کے مالی سرمائے کی مقدار بیان کرتے ہیں تو اُن کی تعداد میں نہایت مبالغہ آمیزی کرتے ہیں، اور عادت جاریہ سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور عجائب پسندی کے وسوسوں

الصادرين عن عساكرهم واستنبطت
احوال اهل الثروة في
بضائعهم وفوائدهم واستجليت
عوائد المترفين في نفقاتهم لما
تجد معشار ما يعدونه وما ذلك
الا لولوع النفس بالغرائب وسهولة
التجاوز على اللسان والغفلة على
المتعقب والمنتقد حتى
لا يحاسب نفسه على خطأ ولا
عمد ولا يطالبها في الخبر
بتوسط ولا عدالة ولا يرجعها
الى بحث وتفتيش فيرسل عنانه
ويسيم في مراتع الكذب لسانه
ويتخذ آيات الله هزوا ويشتري
لهو الحديث ليضل عن سبيل الله
وحسبك بها صفقة خاسرة
(مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۱)

کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ لیکن جب تم خود
متعلقین تیغ و خنک سے اُن کی فوجوں کا حال دریافت
کرو اور دولت مند لوگوں کی دولت کے نتائج اور
ثمرات کے ذریعے اُن کی دولت کا اندازہ کرو اور
دولت مندوں کے مصارف پر اس حیثیت سے
نظر ڈالو کہ اس معاملے میں امراء کی عام عادت کیا ہے؟
تو جو تعداد ان مورخین نے بیان کی ہے اس کا عشر
عشیر بھی تم کو ہاتھ نہ آئے گا۔ یہ مبالغہ آفرینی اس
لیے کی جاتی ہے کہ نفس انسانی عجائبات کا شیدائی
ہے۔ ایسی باتیں آسانی سے مشہور ہو سکتی ہیں،
لیکن اس قسم کے مؤرخ یہ بھول جاتے ہیں کہ آئندہ
زمانے میں لوگ ان روایتوں کی نقد و تحقیق بھی کریں
گے۔ اس لیے وہ اپنی خطا پر اپنے نفس کا جائزہ
نہیں کر لیتے نہ اس کو روایت کی معتدل راہ پر لے
جاتے ہیں اور نہ اس کو تحقیق کی طرف مائل کرتے ہیں
بلکہ وہ مطلق العنان بن جاتے ہیں۔ اپنی زبان کو جھوٹ
کے مرغزاروں میں چراتے ہیں، خدا کی نشانیوں کو
ہنسی مزاح بنا لیتے ہیں، اور لغو باتوں کی ایک دکان لگا دیتے ہیں تاکہ خدا کی سیدھی راہ سے
دُنیا کو گمراہ کریں، لیکن افسوس یہ کیسی ناکامیاب تجارت ہے!!

علامہ موصوف نے اس قسم کی دلیلوں کی متعدد مثالیں دی ہیں اور اُن پر مختلف حیثیتوں سے نقد کیا ہے۔ انھوں نے اگرچہ ان اصول سے چند خاص روایتوں ہی کے انتقاد میں کام لیا ہے لیکن یہ ایسے اصول ہیں کہ عموماً ہر فوجی نقل و حرکت کے نقد و تحقیق روایات میں اُن سے کام لیا جا سکتا ہے۔

علامہ موصوف کی چند پیش کردہ مثالوں کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

(۱) مسعودی مؤرخین اسلام میں بڑے پائے کا مؤرخ شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اس نے بنو اسرائیل کی فوج کی تعداد (جو فرعون کے مقابلے کے لیے جمع ہوئی تھی اور جس کو وادی تیہ میں خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شمار کیا تھا) ۶ لاکھ بتائی ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو خاص پابندیوں کے ساتھ منتخب کیا گیا تھا۔ یعنی ہر سپاہی کی عمر ۲۰ سال سے متجاوز نہ تھی اور وہ جسمانی حیثیت سے معرکۂ جنگ میں شریک قتال ہو سکتا تھا۔

ایک خوش اعتقاد شخص اس روایت کو بآسانی قبول کرے گا۔ لیکن اس پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالنی چاہیے:

(الف) عموماً فوج کی تعداد کا تناسب مُلک کی وسعت کے ساتھ تعلق رکھتا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ فوجی مصارف کا بار اسی مُلک پر ہوتا ہے جس کی وہ حفاظت کرتی ہے اس لیے فوج اور سامان جنگ کی وسعت کا اندازہ صرف مُلک کی آمدنی حالت ہی سے ہو سکتا ہے لیکن [illegible]

اس عظیم الشان فوج کے مصارف کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

(ب) اصول جنگ کے مطابق میدان جنگ میں فوج کی ترتیب اس طرح کی جاتی ہے

کہ ایک صف کو دوسری صف سے اعانت ملتی رہے اور نقل و حرکت کے لیے میدان میں کافی وسعت موجود ہو، لیکن کوئی میدان اس سرزمین میں ایسا ثابت نہیں ہوتا جو ۶لاکھ فوج کی گنجائش رکھتا ہو اور اصول جنگ کے مطابق اس میں فوج کی ترتیب و تنظیم قائم کی گئی ہو۔

(ج) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور اسرائیل کے درمیان چار پشتیں گذری تھیں جس کی کل مدت صرف دو سو برس تھی۔ لیکن چار پشت کے عرصے میں کوئی خاندان اس قدر وسیع نہیں ہو سکتا کہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور مریضوں کے علاوہ ۶لاکھ سپاہی تیار کر دے۔

(د) دنیا میں ایرانیوں کی سلطنت نہایت وسیع اور عظیم الشان سلطنت تھی جس نے درفش کاویانی کے سائے میں دنیا پر ہزاروں برس حکومت کی۔ لیکن قادسیہ کی جنگ میں (جب کہ اس کی موت و حیات کا فیصلہ ہو رہا تھا) اس نے اپنی فوجی طاقت کی سب سے بڑی اور سب سے آخری نمائش کی، تاہم اس کی فوجی قوت ایک لاکھ ۲۰ ہزار سے متجاوز نہ تھی۔ پس حضرت موسیٰ کے فوج کی تعداد اس سے زیادہ کیونکر ہو سکتی ہے؟

(۲) مورخین کا بیان ہے کہ زمانۂ قدیم میں ملوک یمن عموماً افریقیہ اور بربر پر حملہ کیا کرتے تھے۔ سلاطین یمن میں افریقش بن قیس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بربر کی جنگ سے واپس آ رہا تھا تو قبائل یمن میں قبیلۂ حمیر دہیں رہ گیا۔ مغرب کی قوموں میں کتامہ انہی کی اولاد سے ہیں، لیکن بربر کے تمام اہل نسب اس سے انکار کرتے ہیں۔ سلاطین یمن میں ذالاذغار کی نسبت مشہور ہے کہ وہ موصل، آذربیجان، ایران، روم، ماوراء النہر،

سمرقند، اور چین وغیرہ پر حملہ کر چکا تھا اور اُن میں بہت سے ممالک اس کے زیرِ نگیں ہو گئے تھے، لیکن اِن روایتوں کا ایک حرف بھی صحیح نہیں ہے۔ حسب ذیل دلائل پر غور کرو:

سلاطین یمن جزیرۂ عرب میں رہتے تھے اور مغاران کا دارالسلطنت تھا، لیکن جزیرۂ عرب کو تین طرف سے سمندر محیط تھا، صرف سویس کا ایک راستہ کھلا تھا جس سے کوئی فوج مغرب کی طرف نقل و حرکت کر سکتی تھی، لیکن سویس اور بحر شام کا راستہ جن صوبوں میں سے ہو کر گذرتا تھا، وہ عمالقہ، کنعان اور قبط وغیرہ کی زیر حکومت تھے، اور جب تک کوئی فوج اُن سے معرکہ آرا نہ ہو لیتی، اِن راستوں میں سے ہو کر گذر نہیں سکتی تھی، لیکن کسی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا کہ سلاطین یمن نے ان قوموں سے کبھی بھی جنگ کی۔ یمن سے مغرب تک کی مسافت اِس قدر طویل ہے کہ خود کوئی سلطنت اپنے ملک سے فوج کے لیے سامانِ رسد بہم نہیں پہنچا سکتی، اس لیے خواہ مخواہ انہی صوبوں سے رسد کا سامان بہم پہنچانا پڑتا ہوگا، یا لوٹ مار کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ پس جب تک یہ تمام صُوبے فتح نہ کر لیے جائیں، مغرب تک اِس فوج کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔

(۶)

علامہ ابن خلدون نے اقوام قدیمہ کی مذہبی تاریخوں اور قصص کے متعلق جو نقد کیا ہے، اس سے صرف تاریخ اسلام مستثنیٰ ہے۔ اسلام کو اپنے ظہور کے ساتھ ہی فتنہ و فسادفی الارض کے رفع اور حق و سعادت کے دفع کے لئے تلوار کھینچنی پڑی اور ان غزوات کے وقائع خود قرآنِ حکیم نے جا بجا بیان کئے ہیں۔ بلاشبہ

ہم زمان میں اللہ کی غیبی نصرت و اعانت کے نزول و ظہور، اور تعداد قلیل کے مجمع کثیر پر غلبہ و فتح کے اعلانات نظر آتے ہیں۔ لیکن اقوام عالم کے مذہبی قصص کی طرح نہ تو ان میں افسانوں کے سوا کوئی اور مخلوق مصروف پیکار ہوتی ہے اور نہ دیوتاؤں اور اُن کے پرستاروں کے عجیب الخلقت غول نظر آتے ہیں۔ البتہ ملاء اعلیٰ کی وہ مقدس قوتیں اور ملائکہ قدس کی وہ غیر مجسم و غیر متحیز طاقتیں جو انسان سے باہر نہیں بلکہ خود اس کے اندر ہی پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی ہیں، وہ اُبھرتی ہیں اور چند فقیر و بے سروسامان مظلوموں کو دشمنوں کے طاقتور و متکبر صفوں پر بالآخر غالب کر دیتی ہیں:

بَلٰۤی اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓىٕكَةِ مُسَوِّمِیْنَ وَ مَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَ لِتَطْمَىٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ (۳: ۱۲۱)

ہاں بے شک اگر تم میدان جنگ میں ثبات و استقامت کے ساتھ جمے رہو اور اللہ کو حاضر و ناظر یقین کر کے صرف اُسی کا خوف اپنے اندر رکھو اور ایسی حالت میں دشمن یکایک تم پر چڑھ آئیں تو ذرا بھی گھبرانے کی بات نہیں تم یقین کرو کہ خدا تمہیں چھوڑ نہ دے گا۔ وہ پانچ ہزار ملائکہ مسومین سے تمہاری مدد کرے گا اور یہ اللہ نے صرف اس لیے کیا کہ تمہارے لیے بشارت ہو اور تمہارے دلوں میں کامل تسلی آجائے، اور یقین رکھو کہ فتح و نصرت نہیں ہے مگر صرف اللہ ہی کی طرف سے۔

(۷)

لیکن زمانہ جنگ کا اثر صرف فوجی نقل و حرکت کی مبالغہ آمیز روایتوں ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ اخلاق و مذہب تک متعدی ہو جاتا ہے!

اسلام کی تاریخ میں اس قسم کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں ہرقل نے جب

ابوسفیان کو اپنے دربار میں طلب کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مختلف سوالات کیے تو وہ اگرچہ مجبوراً کسی سوال کے جواب میں صداقت کے دائرہ سے ہٹ نہ سکا، تاہم جب ہرقل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پابندی عہد کے متعلق دریافت کیا تو چھپی ہوئی عداوت اُبھر آئی اور باوجود علم و یقین کے آپ کے وفائے عہد کا صاف صاف اقرار نہ کر سکا۔ چنانچہ ابوسفیان نے اس کے جواب میں کہا:

نَحْنُ فِی مُدَّۃٍ لَا نَدْرِی مَا هُوَ فَاعِلٌ فِیهَا (بخاری)

اس وقت تو صلح کا زمانہ ہے۔ کیا معلوم کہ وہ اپنے عہد کو وفاداری اور پابندی کے ساتھ نبا ہیں گے بھی یا نہیں۔

ابوسفیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے فضائل پر بھی پردہ ڈالنا چاہتا تھا، لیکن آفتاب پر کیوں کر خاک ڈالی جا سکتی تھی؟ اس لیے فریب کا موقع صرف اِسی سوال کے جواب میں مل سکا اور اس کو خود اس کا اعتراف ہے۔

لَمْ تُمْکِنِّی کَلِمَۃٌ اُدْخِلُ فِیهَا شَیْئًا غَیْرَ هٰذِهِ الْکَلِمَۃِ (بخاری)

مجھ کو بجز اس بات کے کہ کسی دوسری بات کے اضافہ کرنے کا کہیں موقع ہی نہ ملا۔

جنگ ہی کی تخصیص نہیں، معمولی بُغض و عداوت بھی روایت کی حیثیت بدل دیتی ہے اور ایک دشمن کے مثالب و معائب کا اثر اس کے دوسرے دشمن پر عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔

(۸)

غرض کہ ان تمام حقائق سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگ کا زمانہ پُرآشوب بالخصوص فن روایت کے اختلال و بے اثری کا ایک ایسا عہد مشئوم ہوتا ہے جب تاریخ و وقائع نگاری کی حقیقت بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ نفس انسانی کی تمام کمزوریاں پوری طرح کام

کرنے لگتی ہیں، اور فنِ روایت اس عہد میں آکر بالکل بے کار ہو جاتا ہے:

محدثینِ اسلام نے اگرچہ اِن روایتوں کے متعلق کوئی جدید قاعدہ وضع نہیں کیا، بلکہ جرح و تعدیل کے جو عام اصول ہیں انہیں کو ان روایتوں کا بھی معیار قرار دیا لیکن قرآن مجید نے ان روایتوں کی طرف خاص اعتناء کی ہے، اور اُن کے قبول سے جا بجا ممانعت کی ہے۔

جنگ کے زمانے میں بُغض و انتقام کے جذبات مُشتعل رہتے ہیں اور جماعت کا دماغی اضطراب ہر قسم کی رطب و یابس روایتوں کو ڈھونڈھتا رہتا ہے اور اس کو نہایت آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔ اِس بناء پر جن روایتوں میں کسی فریق کے بُغض و انتقام کی علانیہ جھلک نظر آتی ہے، ان کے متعلق قرآن نے عام حُکم دے دیا کہ اِن روایتوں کی تحقیق کی ضرورت ہی نہیں، اِس قسم کے تمام موقعوں پر راویوں کی ثقاہت و عدم ثقاہت سے کوئی بحث نہیں کرنی چاہیے، بلکہ سُننے کے ساتھ ہی شدت کے ساتھ انکار کر دینا چاہیے۔

چُنانچہ منافقین نے جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو متہم کیا اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف ذرائع سے اس کی تحقیق کی اور جب اس پر بھی تسکین نہ ہوئی تو ایک مہینے تک وحی الٰہی کا انتظار کیا تو اس وقت خدا نے حضرت عائشہؓ کی براءت میں دس آیتیں نازل فرمائیں۔ ایک آیت میں اس روایت کی تحقیق پر عام طور پر اظہارِ عتاب بھی فرمایا،

لَوْلَآ إِذْ سَمِعْتُمُوهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُونَ	تم لوگوں نے اِس واقعے کے سننے کے ساتھ ہی محض حسنِ
وَالْمُؤْمِنَٰتُ بِأَنفُسِهِمْ خَيْرًا وَقَالُوا	نفس کی بناء پر اور اپنے ساتھ نیکی کا گمان کر کے کیوں نہیں
هَٰذَآ إِفْكٌ مُّبِينٌ	یہ کہہ دیا کہ یہ تو کھلی ہوئی تہمت ہے

اِس آیت سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ایک فریق کی خباثت اخلاق اور دوسرے فریق کے طہارت نفس کا اثر بھی روایتوں پر پڑتا ہے، اور چونکہ زمانۂ جنگ میں اس قسم

کے خبیثانہ اخلاق کے نتائج کا ظہور عموماً ہوتا رہتا ہے، اِس لیے اِس قسم کی روایتوں کے متعلق کسی قسم کی تفتیش وتحقیق کی ضرورت ہی نہیں۔ اصلاً اِن پر کان دھرنا ہی نہیں چاہیئے؛

(۹)

بُغض وانتقام کا اثر ایک دوسری صورت میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ جنگ کے بعد جب مفتوح قوم فاتح کے زیرِ اثر ہو جاتی ہے۔ ایک مدت تک باہم اعتماد قائم نہیں ہوتا اور بات بات میں بدگمانیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اِسلام بھی اس عالم گیر اصول سے مُستثنیٰ نہ تھا۔ اس نے عرب کے مُختلف قبائل کو مسخر کر لیا تھا، لیکن اب تک وہ مسلمانوں سے بالکل شیر وشکر نہیں ہوئے تھے۔ ان کے معتقدات وجذبات کا ابھی کافی اندازہ بھی نہیں ہُوا تھا، اِس لیے بعض واقعات ایسے پیش آئے جس نے خطرناک بدگمانیاں پیدا کر دیں۔

قبیلہ بنو مصطلق تمام احکام اِسلام کا مطیع ہو چکا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو اس کے یہاں صدقہ کا مال وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ اُن لوگوں کو خبر ہوئی تو استقبال کے لیے جمعیتِ عظیم کے ساتھ آگے بڑھے لیکن ولیدؓ کے دِل میں یہ بدگمانی پیدا ہو گئی۔ وہ سمجھے کہ یہ لوگ لڑنے کے لیے آرہے ہیں۔ چُنانچہ وہیں سے پلٹ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو خبر کی کہ وہ لوگ دائرہ اطاعت سے باہر ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اِس پر یہ آیت نازل ہوئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ

مسلمانو اگر تمہارے پاس ایک فاسق کوئی خبر لے کے آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو ایسا نہ ہو کہ اس خبر کی بنا پر کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور پھر تم کو اپنے کئے پر نادم ہونا پڑے۔

مفسرین کرام کو اس شان نزول پر یہ شُبہہ ہے کہ غلطی کی بناء پر ولید بن عقبہ رضؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو فاسق نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اِس آیت کا تعلق درحقیقت اُن کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ خُدا نے ایک عام اصول کے طور پر بتادیا ہے کہ جب زمانۂ جنگ میں خود مسلمان غلطی کر سکتے ہیں تو فاسق لوگوں کی روایتوں کو تو اور احتیاط سے قبول کرنا چاہیئے۔

یہی وجہ ہے کہ صحاح سِتّہ میں غزوات اِسلامیہ کا ذِکر نہایت سادہ، مختصر اور خالی از مبالغہ طریقے سے کیا گیا ہے اور ابن اسحٰق وغیرہ کی روایتیں بالکل حذف کر دی گئی ہیں۔ اِس لیے جہاں تک غزواتِ اسلامیہ کا تعلق کتُب حدیث سے ہے، دُنیا کی کوئی تاریخ صحت کے لحاظ سے اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی۔ بلاشُبہہ یہ محدثین کرام کا بڑا احسان ہے کہ انھوں نے خُون کی چادروں کو چاک چاک کر کے واقعات کے ایک ایک ذرے کو جمع کیا۔ اور پھر اِس قدر صاف کر دیا کہ ان پر خُون کا اب ایک دھبّہ بھی نظر نہیں آتا۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ہ

جنگ کا اثر
اخلاق پر

(۱)

دُنیا کے گوشے گوشے میں قوت کا خزانہ پنہاں ہے۔ بجلی کی رو خاک کے ہر ذرّے میں موجود ہے۔ نمو کی قوت زمین کے چپّے چپّے میں مخفی ہے۔ موجوں کا تلاطم ہر دریا کے اندر چھپا ہوا ہے۔ لیکن یہ قوتیں خود بخود نہیں اُبھرتیں، بلکہ اپنے ظہور کے لیے ایک سخت کش مکش، ایک سخت مقاومت، ایک سخت تصادم کی منتظر رہتی ہیں۔ پس جب قوت اُن کو ٹھوکر لگا دیتی ہے تو وہ برہم ہو کر اپنے چہرۂ تابناک سے نقاب اُلٹ دیتی ہیں۔ حرکت بجلی کے خزانے میں آگ لگا دیتی ہے۔ سیلاب کی رو زمین کی قوتِ نمو کو اُبال دیتی ہے ہوا کے جھونکے سطح دریا پر موجوں کا جال پھیلا دیتے ہیں!

اخلاق بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون وار دواح میں چھپی ہوئی ہے۔ لیکن اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو وہ مشامِ جان کو معطر نہیں کر سکتا۔ اس کی بوئے

جانفزا بار بار کے ہلنے ہی سے پھیلتی ہے۔ اِسی طرح اگر انسان تمام دُنیا سے الگ ہو کر ایک قلعہ کوہ پر عزلت گزینی اختیار کرلے تو اس کا اخلاقی جوہر ہمیشہ کے لیے پہاڑ کے تاریک غاروں میں چھپ جائے گا۔ لیکن خدا نے انسان کو اخلاق کی نمائش کرنے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔ اِسی بناء پر انبیاء کرام علیہما السّلام نے اپنی بعثت کا مقصد تکمیل اخلاق قرار دیا۔ وہ خود بھی دُنیا کے منظرِ عام پر نمایاں ہوئے اور اپنی اُمّت کو بھی نمایاں کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے اپنی اُمّت کی نمائش وادی تیہ میں کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے اِس مقصد کے لیے ایک وادی غیر ذی زرع کو منتخب فرمایا، اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم نے تو کائنات عالم کے ہر میدان میں اپنا اور اپنی اُمّت کا اسوۂ حسنہ پیش کر دیا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ	تم لوگ دُنیا کی ایک بہترین اُمّت ہو جو منظرِ عام پر نمایاں کی گئی۔ کیونکہ تم نیکی کا حکم کرتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو
وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا	اور ہم نے تم کو ایک صاحب عدل و معدلت قوم بنایا کہ تم تمام دُنیا کے آگے اپنی زبان و عمل سے حق کی شہادت دو، اور اس شہادت کی روشنی صرف اپنے رسول سے اخذ کرو

اسلام نے اِسی اصول کی بنا پر رہبانیت کو ناجائز قرار دیا کیونکہ انسان کا اخلاقی جوہر بھی دُنیا کی دوسری قوتوں کی طرح تصادم و کشمکش ہی کے ذریعے نمایاں ہو سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو اخلاقِ حسنہ کا مظہر بنایا ہے جیسا کہ خود فرماتا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ — ہم نے انسان کو ایک بہترین طبیعت مرکبہ عادلہ میں پیدا کیا۔

اِس لیے اُس نے ایسے اسباب مہیّا کر دئیے جو انسان کے خاصۂ اخلاقی کو ہر وقت نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک شخص گھر میں ہے تو اعزاء و اقارب کے تعلقات سے اس کے اخلاق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، اگر بزمِ احباب میں ہے، تو دوستوں کے اختلاط و ارتباط کو اس کے اخلاق کا معیار بنایا جا سکتا ہے، اگر وہ کسی بازار میں ہے تو معاملات کے ذریعے سے اس کے عیب و ہنر نمایاں ہو سکتے ہیں۔

لیکن جنگ ایک ایسی سخت ٹھوکر ہے، ایک ایسا سخت زلزلہ ہے، ایک ایسا سخت دھماکہ ہے، جس سے دُنیا کا ایک ایک ذرّہ جُنبش میں آ جاتا ہے، اور اس کی تمام قوتیں دفعتاً متحرک ہو جاتی ہیں۔

اخلاق بھی ایک عظیم الشان قوت ہے اِس لیے وہ بھی جنگ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا ہے، اور اس کے اثر سے اِنسان کے نظامِ اخلاق میں ایک نمایاں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی علت ہے کہ اسلام نے اپنے تمام اعمالِ تربیت کے لیے اخلاقی مؤثرات میں سے صرف جہاد ہی کو منتخب کیا، کیوں کہ اخلاقی انقلاب کا اِس سے زیادہ کوئی مؤثر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

زمانۂ جنگ میں عارضی طور پر انسان کا نظامِ اخلاق دفعتاً بدل جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عیب، ہُنر اور ہنر، عیب ہو جاتا ہے۔ تجسّس ایک سخت بداخلاقی ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں جاسُوسی ایک ہُنر خیال کی جاتی ہے اور اس کے لیے بہترین قابلیت کے اشخاص مُنتخب کیے جاتے ہیں۔ صیانتِ نفس ہر انسان کا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن میدان

جنگ سے فرار انتہا درجے کی بداخلاقی سمجھی جاتی ہے۔ محاسن اخلاق میں رحم دلی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں، لیکن صفِ دشمن میں اس کی کوئی قدر دانی نہیں کی جاتی۔ غیروں کے حقوق کی حفاظت تمدّن و قانون کا بہترین کارنامہ ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں قانون ہی غیروں کے مُلک کا دوسری سلطنتوں کے ساتھ الحاق کر دیتا ہے اور مالِ غنیمت جس طرح وحشی قوموں کے لیے ذریعہ معاش تھا، اسی طرح تمدّن کا بھی بہترین اندوختہ بن جاتا ہے۔ امن کی حالت میں عفو و درگذر، حلم و تحمّل اپنے اندر ایک اخلاقی مقناطیسی کشش رکھتی ہیں، لیکن صفِ جنگ میں طاقت وجبر اور ظلم آمیز تبسّم سے زیادہ درشت دلی کی قدر کی جاتی ہے۔ کفایت شعاری نہایت عُمدہ چیز ہے، لیکن میدان جنگ صرف اسراف ہی کے ذریعے سے فتح ہو سکتا ہے۔ وفائے عہد کی اخلاقی عظمت کا ہر شخص اعتراف کرتا ہے، لیکن زمانۂ جنگ میں سینکڑوں اخلاقی عیب و ہُنر ہیں جن کی حقیقت زمانۂ جنگ میں بالکل بدل جاتی ہے، اور ضرورت ان کے بدل دینے کے لیے مجبور کرتی ہے۔

لیکن ابتدا میں دُنیا کی ہر چیز عارضی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ مُستقل صورت اختیار کر لیتی ہے۔ عارضی اسباب سے زمین پر پانی کے قطرے گرتے ہیں، اور آہستہ آہستہ زمین میں سوراخ کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ مُستقل گڑھے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایک پتھر پر آفتاب کی شعاعیں پڑتی ہیں اور وہ ان کا رنگ جذب کرتا جاتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن لعل شب چراغ کے قالب میں نمایاں ہو کر دُنیا کی آنکھ کو خیرہ کر دیتا ہے!
انسان کے اخلاق و عادات کا بھی یہی حال ہے۔ بچّہ ماں کے پیٹ میں سے ایک سادہ شیشۂ دِل لے کر آتا ہے جس میں ہر عکس کے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

دُنیا کی جو طاقت اُس پر اپنا پرتو ڈالتی ہے، آہستہ آہستہ اُسی اثر کو قبول کرتا جاتا ہے، اور ایک دن اُسی قوت کا مجموعی اثر اس کا اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے۔ انسان کے اخلاق کا سب سے بڑا مظہر ملوت ہے، لیکن یہ ملکہ بھی کسی فعل کے متواتر عمل میں لانے ہی سے پیدا ہوتا ہے۔

اس عالمگیر قدرتی اصول کی بنا پر جن قوموں کو جغرافیانہ حالات، تمدنی ضروریات اور قومی خصوصیات ہمیشہ جنگ کے لیے تیار رکھتی ہیں، وہ اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ میدانِ جنگ ہی میں بسر کرتی ہیں۔ یہی عارضی نظام اخلاق ان کا مستقل اخلاقی دستور العمل بن جاتا ہے، اور وہ ان اخلاقی خصوصیات میں تمام دُنیا سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔ ترکوں کی جنگ جوئی عام طور پر ضرب المثل ہے:

چناں بہ بردند صبر از دلم کہ ترکاں خوان یغمارا!

زمانۂ جنگ میں جن اخلاق و عادات کو ناگزیر خیال کیا جاتا ہے، ان میں بہت سے ایسے ہیں جن سے بلا تکلف بے نیازی حاصل ہو سکتی ہے۔ جنگ کے لیے اگرچہ جاسوسی ایک ضروری چیز ہے، لیکن جاسوس فوج کے ضروری اجزا نہیں ہوتے۔ میدانِ جنگ میں کبھی کبھی دشمن پر رحم بھی کیا جا سکتا ہے۔ فقر و فاقہ کی حالت میں جنگ جاری رکھی جا سکتی ہے۔ اور دولت کی بارش اس کے لیے چنداں ضروری نہیں۔ لیکن "شجاعت" ایک ایسی چیز ہے جو جنگ کی حقیقت میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی شخص میدانِ جنگ میں عزم و استقلال کے ساتھ کھڑا رہنا چاہتا ہے، تو اس کو سب سے پہلے اپنے پاؤں میں اس کی سنہری زنجیر ڈال لینی چاہیے۔

جن قوموں کو کسی اتفاقی ضرورت سے لڑنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اُن کے لیے بھی شجاعت

نہایت ضروری ہے، لیکن جو قومیں ہمیشہ لڑتی بھڑتی رہتی ہیں، ان میں شجاعت کا ایک مخصوص ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے وہ خاص طور پر اس وصف میں دوسری قوموں سے ممتاز خیال کی جاتی ہیں۔

مرد، عورتوں سے زیادہ بہادر ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے مختلف لوگوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، یہی کش مکش ان کے جذبات شجاعت کو زیادہ نمایاں اور مستحکم کر دیتی ہے۔

لیکن اگر متمدن اور وحشی قوموں کا مقابلہ کیا جائے تو ان میں بھی مرد اور عورت کی سی نسبت نظر آئے گی۔ متمدن قوم ایک عظیم الشان شہر کی چار دیواری میں محصور رہتی ہے۔ اس کو خارجی خطرات کا بالکل ڈر نہیں رہتا۔ شہر کے اندر پولیس حفاظت کرتی ہے۔ وہ امن و سکون کی حالت میں آرام کی نیند سوتی ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ اس کی قوت دفاعی بیکار ہو جاتی ہے اور شجاعت کے جذبات مُردہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن ایک بدوی کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے وہ کھلے ہوئے میدان میں رہتا ہے اور اپنی تمام چیزوں کی حفاظت خود ہی کرتا ہے۔ چور، ڈاکو، غنیم، اس پر حملہ کرتے ہیں، اور وہ صرف اپنی قوت بازو سے ان کو دفع کرتا ہے۔ اس لیے اس کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ ٹھوکر لگتی رہتی ہے، اور اس سنگِ چقماق سے ہمیشہ شرارے نکلتے رہتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے پہلو میں ایک گرم دل اور دل میں گرم خون کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہی خون اس کی رگوں میں ہر وقت حرکت پیدا کرتا رہتا ہے اور وہ ایک معمولی سی صدا پر میدان جنگ کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔

عرب جس نے قیصر و کسریٰ کے تخت و سلطنت کو دفعتاً الٹ دیا، اسی قسم کی

شجاعت کا مرکز تھا۔ یہاں تک کہ زمانہ جاہلیت میں بہادروں کا ایک خاص طبقہ پیدا ہوگیا تھا جو ہمیشہ گھوڑے کی لگام زنار کی طرح اپنے گلے میں آویزاں رکھتا تھا اور ہر وقت میدانِ جنگ کے لیے پا برکاب رہتا تھا۔ فارسی لٹریچر میں "پا برکاب" کے استعارے کو بھی جنگ ہی کی عاجلانہ مستعدیوں نے پیدا کیا ہے۔

لیکن کبھی کبھی صرف ایک ہی ممتد اور عظیم الشان جنگ اس قسم کی مستقل شجاعت پیدا کردیتی ہے اور فتح و ظفر کی نشاط انگیز مسرت اس آتش سیال کو اور بھی دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ آج ہمیں کئی قومیں ایسی نظر آتی ہیں جو اگرچہ ہمیشہ مصروفِ جنگ نہیں رہیں، لیکن صرف ایک ہی فاتحانہ جنگی اقدام، یا ایک ہی بامراد معرکۂ قتال نے ان کو ایک مستقل اور دائم و قائم جنگی قوم بنا دیا ہے!

تاتاریوں کی مشہور شجاعت بھی اسی عالمگیر طوفان کی ایک موج ہے جو ساتویں صدی میں تمام دنیائے اسلام میں پھیل گیا تھا، اور بعد کی صدیوں میں ہجوم اعداء نے اس کو اور بھی مستقل کر دیا۔

اس مستقل شجاعت کا اثر صرف میدانِ جنگ ہی میں ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ زندگی کے ہر شعبہ عمل میں اس کی جھلک نظر آتی تھی۔ وہ تمام قوم میں ایک حرکت پیدا کردیتی ہے جو اس کے تمام قوائے خفتہ کو بیدار رکھتی ہے۔ جرمنی کی جنگ پرستی کا نشہ فرانس و بلجیم کے میدانوں سے زیادہ برلن کے کارخانوں، کالجوں، عام بازاروں میں نظر آیا تھا۔

قوائے کا یہ نشاط قوموں کی افزائشِ نسل پر بھی نمایاں اثر ڈالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیر سے اُبھرنے والی بہادرانہ قوت جب ایک پنجرے میں بند کر دی جاتی ہے تو اس کا شجاعانہ نشاط فنا ہو جاتا ہے، اور اس کے توالد و تناسل کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔

اِس کے برعکس بُزدل قوم قلیل النسل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مدت کی غلامی کا افسردہ کُن امن مفتوح غلاموں کو فنا کر دیتا ہے۔

لیکن ایک ہی قوت متضاد نتائج بھی پیدا کر سکتی ہے۔ پانی کی طغیانی اگر سطحِ دریا پر موجوں کے سرِ پُر غرور کو بلند کر دیتی ہے تو بہت سر اٹھانے والے کنگرے اس کی رَو میں پست بھی ہو جاتے ہیں۔ اِس لیے جنگ اگر ایک قوم کے جذبۂ شجاعت کو ہمیشہ کے لیے اُبھار دیتی ہے، تو دُوسری قوم کو ہمیشہ کے لیے بُزدل بھی بنا دیتی ہے۔ شخصی حالتوں میں یہ بُزدلی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

اِنگلستان کے مشہور فلاسفر ٹامس ہوب نے اپنی بُزدلی کی یہ وجہ بتائی ہے کہ وہ جس زمانے میں اپنی ماں کے پیٹ میں تھا انگلستان کو اسپینش لوگ جنگ و غارت گری کی دھمکیاں دیتے رہتے تھے اور اُن کی فوجیں عموماً ساحلِ انگلستان کا چکر لگایا کرتی تھیں اس وقت تمام انگلستان کے ساتھ اس کی ماں بھی اضطراب و خوف میں مبتلا تھی۔ اس کے اضطرابِ عصباتی نے بچے میں یہ بُزدلی پیدا کر دی!

اِنگلستان کے سلاطینِ قدیم میں یعقوب ثانی سخت بُزدل تھا۔ اِس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی ماں نے سخت مصیبت و اضطراب کی حالت میں زندگی بسر کی تھی اور اس کا قدرتی اثر اس کے بچے پر بھی پڑا تھا۔

(٢)

اجتماع و انضمام کی حالت میں اگرچہ افراد کی خصوصیات فنا ہو جاتی ہیں اور ایک مُستقل اجتماعی قوت پَیدا ہو جاتی ہے، لیکن بوسیدہ اینٹیں کب تک دیوار کو قائم رکھ سکتی ہیں؟ بالآخر افراد کی مخفی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے، اور یہ شیرازہ دفعۃً درہم برہم ہو جاتا ہے۔ سنہ ۱۸۷۰ء کی شکست نے فرانسیسیوں کے جذبات شجاعت کو بالکل پامال کر دیا تھا۔ اس کے بعد اگرچہ بظاہر ے، شورش، تعلیم اور مختلف انقلابات نے ان کے خون کو بہت کچھ گرم کر دیا، تاہم میدانِ جنگ میں وہ اپنے قدیم داغ کو نہ چھپا سکے اور باوجود تزاکم افواج و تعاضد خلفاء اپنی کھوئی ہوئی شجاعت کو واپس نہ بُلا سکے۔

متصل ذلّت آمیز شکستوں کا اثر کبھی کبھی اِس قدر مُستقل ہو جاتا ہے کہ روحانی طاقت بھی بہ مُشکل اس کو مٹا سکتی ہے۔ یہودیوں کو بار بار شکست اور ایک زمانہ ممتد کے اُسر و غلامی نے اِس قدر بُزدل بنا دیا تھا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بیت المقدس میں ان کا فاتحانہ داخلہ کرانا چاہا تو اُن کی رعد آسا آواز، بیت المقدس کی مذہبی عظمت بھی یہودیوں کے دلوں کو نہ گرما سکی، اور انھوں نے صاف صاف کہہ دیا:

يٰمُوْسٰىٓ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ (٦ : ٢٧)

اے موسیٰ! جب تک وُہ طاقتور لوگ بیت المقدس میں لڑنے کے لیے موجود ہیں ہم کبھی بھی اس میں داخل ہونے کی جُرأت نہیں کر سکتے۔ تم اپنے خُدا کے ساتھ جاؤ اور لڑو ہم اِسی جگہ بیٹھے تماشہ دیکھیں گے۔

لیکن عرب کی کبھی شکست نہ کھانے والی طاقت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھیک ایک ایسے ہی موقع پر جواب دیا تھا:

لانقول کما قال قوم موسیٰ اذھب انت و ربك فقاتلا ولکنا نقاتل عن یمینك و من شمالك، و بین یدیك و خلفك (بخاری)

یارسول اللہ ہم آپ کو وہ جواب نہ دیں گے جو موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کو دیا تھا کہ تم اپنے خدا کے ساتھ جاؤ اور لڑو بلکہ ہم آپ کے دائیں، آپ کے بائیں، آپ کے آگے، آپ کے پیچھے، غرض ہر طرف سے جمع ہو کر اور قدم بقدم ہو کر لڑیں گے اور اپنی جانوں کو آپ پر نثار کریں گے!

دراصل یہی وہ اختلاف حالت ہے جس سے "اُمتِ مسلمہ" اور "خیر الامم" اور "شہداء علی الناس" کی حقیقی خصوصیات واضح ہوتی ہیں، اور یہی وہ خصائص ہیں جنھوں نے مسلمانوں کو مَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ یعنی یہود، اور اَلضَّآلِّیۡنَ یعنی نصاری کی راہ سے الگ کر کے الذین انعم اللہ علیھم من النبیین والصدیقین کی صراط مستقیم پر قائم کر دیا تھا اور یہی ان کی وہ فضیلت مخصوص ہے جس کی بنا پر زبان الہی نے مغضوبیت کی جگہ محبوبیت کا مرتبہ اعلیٰ انھیں عطا کیا اور فرمایا: یحبھم ویحبونہ خدا اُن کو پیار کرے گا اور وہ خدا کو پیار کرنے والے ہوں گے رضی اللہ علیھم ورضوا عنہ وہ گذشتہ اقوام کی طرح مغضوب و مغبوض کیونکر ہو سکتے ہیں حالانکہ ان کے ایثار اور قربانی و ابتغاء مرضات اللہ کی وجہ سے خدا اُن سے راضی ہوا اور وہ اللہ کی بخشی ہوئی خلافت و وراثت ارضی پا کر خدا سے راضی و خوشحال ہیں!

لیکن اس قسم کی مستقل شجاعت کبھی کبھی عارضی شکست بھی کھا جاتی ہے۔ مگر اس حالت میں بھی صرف فوج ہی کی جمعیت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ دل مضبوط و استوار رہتا ہے۔ غزوۂ احد میں ابتلاء الہی نے صحابہ کو منہزم کر دیا تھا لیکن اُن کی جانبازی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پروانہ وار فدا ہوتے رہے جس طرح غزوۂ بدر میں فدا ہوئے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک موقع پر گردن

بلند کر کے کفار کی جمعیت کو دیکھنا چاہا تو ابو طلحہؓ کے جوش فدویت نے آپ کو یہ کہہ کر روکا:

لا تشرف یصیبک سہم من سہام القوم نحری دون نحرک (بخاری)	آپ سر اُٹھا کر نہ دیکھئے، ایسا نہ ہو کہ آپ کے کوئی تیر لگ جائے ابھی تو میرا سینہ آپ کے سینہ کے لیے سپر ہے۔

محاسن اخلاقی میں باہم ایک سلسلہ ربط و اتحاد کا ہوتا ہے، اس لیے ایک خلق دوسرے خلق کو پیدا کرتا ہے۔ اگر ایک شخص میں فیاضی کا مادہ ہے تو وہ فطرتاً رحمدل اور رقیق القلب بھی ہوگا۔ اگر کوئی شخص بخیل ہے تو سنگ دلی اُس کے لیے لازمی ہے یہی حال شجاعت و بزدلی کا بھی ہے۔ ان کے نتائج و آثار صرف میدانِ جنگ ہی میں نظر نہیں آتے ۔ وہ ایک سلسلۂ اخلاق پیدا کر دیتے ہیں، جس کا اثر ملک و قوم کی زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ ایک جنگ جو اور بہادر قوم بالطبع اولوالعزم، بلند حوصلہ، باضابطہ، مشقت پسند اور فیاض طبع ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اولوالعزمانہ سیر و سیاحت کرتی ہے۔ علمی تحقیقات میں مختلف ملکوں میں خاک چھانتی پھرتی ہے، فقر و فاقہ اس کے عزم و ارادہ میں خلل انداز نہیں ہو سکتے ۔ وہ اپنی دولت کو مفید کاموں میں بے دریغ صرف کرتی ہے۔ لیکن بزدلی انسان میں عورتوں کی خصوصیات پیدا کر دیتی ہے۔ اس لیے غیر جنگی اقوام فنونِ لطیفہ کی طرف اپنا میلان ظاہر کرتی ہیں۔ رقص و سرود میں اُن کو لطف آنے لگتا ہے۔ شب و روز عیش پسندی میں مصروف رہتی ہیں۔ جامہ زیبی اُن کی فطرت بن جاتی ہے ۔ تمام ضروری کاموں کو چھوڑ کر ملاہی و ملاعب ہی میں مشغول ہو جاتی ہیں۔ اسلام جن اولوالعزم بزرگوں کی ذات پر ناز کرتا ہے، وہ وہی لوگ تھے جو فوجی روح کو زندہ کر کے خود نتا

ہو گئے۔ چنانچہ امتداد زمانہ کے ساتھ یہ رُوح پژمُردہ ہوتی گئی اسی قدر مُسلمانوں میں عیش پرستی کا میلان ترقی کرتا گیا۔ مسلمانوں کو بغداد کے تمدن و علوم و فنون پر بڑا ناز ہے، لیکن وہ بھی سلاطین کی بزم طرب کا ایک گلدستہ تھے۔ ہمارے نزدیک یہ کوئی فخر کی چیز نہیں بلکہ ایک حدیث نبوی جو امام بخاری نے صدہا میلوں کا سفر کر کے حاصل کی دراصل ان تمام علوم سے بدرجہا زیادہ بیش قیمت ہے۔

شخصی حالتوں میں اگر ایک شہری پر کوئی حملہ کر دے تو پولیس اُس کی حفاظت کرے گی۔ لیکن اگر اُسی شخص کو میدان جنگ میں کھڑا کر دیا جائے تو اس کو صرف اپنی ہی حفاظت نہیں کرنی ہوگی، بلکہ وہ دوسروں کی حفاظت کا بھی ذمہ دار ہوگا۔ میدانِ جنگ سے فرار اسی بناء پر عار بلکہ جُرم خیال کیا جاتا ہے۔ اِنسان کو وہ جذبہ اپنے ساتھ دوسروں کی اعانت و تعاون پر آمادہ کرتا ہے، اِسی کا نام عصبیت ہے۔ وہ فطرتاً ہر شخص میں موجود ہے۔ ایک بھائی اپنے بھائی کی مصیبت نہیں دیکھ سکتا۔ بیٹا باپ کی ذلّت برداشت نہیں کر سکتا۔

لیکن عصبیت کا کامل ظہور صرف زمانہ جنگ ہی میں ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو قومیں ہمیشہ امن و سکون کی زندگی بسر کرتی ہیں، اُن میں بہت کم عصبیت پائی جاتی ہے۔ ایک متمدن شہری باشندے کو اپنے بھائی سے زیادہ پولیس پر اعتماد ہوتا ہے۔ لیکن ایک وحشی انسان پولیس کی اعانت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا اِس لیے وہ خود ہی اپنی حفاظت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی قوم کی اعانت پر آمادہ رہتا ہے۔

متواتر جنگ جذبۂ عصبیت کو ابھارتی رہتی ہے اور متصل امن و سکون اس آگ کو بجھا دیتا ہے۔ اسی لیے جو قومیں جنگجو ہوتی ہیں، اُن میں شدت کے ساتھ

عصبیت پائی جاتی ہے۔ لیکن جن قوموں کو میدان جنگ میں جانے کا موقع نہیں ملتا اُن میں یہ روح بہت کم پائی جاتی ہے۔ ایک متمدن شخص میدان جنگ کے اندر اپنی حفاظت میں مصروف رہے گا لیکن ایک تنگجو قوم کا فرد اپنے بھائی کی حفاظت کو اپنی ذات پر مقدم رکھے گا۔ اِس قسم کی عصبیت اگرچہ حقیقی طور پر متحد النسب لوگوں میں پائی جاتی ہے، لیکن معاہدے اور مختلف سیاسی تعلقات کے ذریعے سے دو حلیفوں میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ اور یہ مصنوعی عصبیت زمانۂ جنگ ہی کے لیے پیدا کی جاتی ہے۔

عصبیت اپنے اندر محاسنِ اخلاق کا ایک بڑا ذخیرہ رکھتی ہے وہ خود غرضی کو بالکل مٹا دیتی ہے۔ ایثار نفس کی تعلیم دیتی ہے وہ انسان میں چُستی و چالاکی پیدا کرتی ہے اور ایک کی آواز پر تمام قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک قوم کے اخلاق و عادات کو محفوظ رکھتی ہے اور اس کو کسی دوسری قوم میں مدغم نہیں ہونے دیتی۔ شجاعت اگرچہ بجائے خود ایک جوہر ہے، لیکن عصبیت اس کو جلا دیتی ہے، اور اس کے ذریعے متعدد قطرے باہم مل کر سیلاب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہی ہے جو میزانِ عدل کو قائم رکھتی ہے اور وہی ہے جو ظلم و جور کا سختی سے انکار کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن قوموں میں ربط و اتحاد اور تعاون و تناصر کا مادہ نہیں ہوتا اور اس کی جگہ خود غرضی، تفرقہ، شقاق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، ان میں جنگ ہی کے ذریعے عصبیت پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس طرح یکا یک اتحاد عالم ہر طرح کے اختلافوں کو مٹا کر نابود کر دیتا ہے۔ اسلام نے ولولۂ جہاد سے عرب کی اُن تمام مختلف جماعتوں اور مختلف نسلوں کو ایک کر دیا تھا، جو آگے چل کر اور تمدن کا امن پا کر ایک نہ رہ سکے، اور باہمی جنگ و جدال شروع ہو گیا۔ بسمارک نے صرف اسی لئے صدہا مکر و فریب کر کے جرمنی

فرانس کی پچھلی جنگ پیدا کی تھی، اور موجودہ جنگ نے انگلستان اور آئرلینڈ کے اخلاق اور سول دار کو جس طرح مٹا دیا، وہ سب کے سامنے ہے

جنگ جُو اور بہادر قوموں کے جذبۂ محبت کی حالت تمام دُنیا سے مُختلف ہوتی ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنی، پھر اپنے اہل و عیال کی، اس کے بعد اپنی قوم کی محبت رکھتا ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ایک جنگ خواہ شخص اپنی جان کو سب سے زیادہ ارزاں سمجھتا ہے۔ اور اسی لیے اپنے آپ کو سب سے پہلے خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ اللہ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

انا لنرخص یوم الروع انفسنا
ولو نسام بھا فی الامن اغلینا

ہم لڑائی کے دن اپنی جانوں کو بہت ارزاں کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر امن کی حالت میں ہم سے ان کا نرخ پوچھا جائے تو وہ بہت ہی قیمتی نکلیں گی!!

وہ عموماً میدانِ جنگ میں رہتا ہے۔ اس کو اپنی بی بی اور بچوں سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ اس لیے اُن سے بہت کم محبت کرتا ہے۔ ایک بدو گھر میں بھوکا پیاسا آیا اور کھانا مانگا۔ گھر والوں نے اُس کو مبارک باد دی کہ "تمہارے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے" اور ساتھ ہی بچے کو گود میں رکھ دیا۔ اُس نے اپنے بہادرانہ جذبے سے معمور ہو کر کہا: ° ° ° ° ° ° ° ° ؟ کیا میں اس کو کھاؤں؟ کیا میں اس کو پیوں؟

عرب کا ایک بہادر اونٹنی کا تمام دودھ اپنے گھوڑے کو پلا دیا کرتا تھا۔ اُسے اپنے اہل و عیال کی کچھ پروا نہ تھی۔ اس کی بی بی نے شکایت کی تو اُس نے معذرت

میں چند شعر کہے:۔

تلوم علی ان اصنع الورد بفحۃ
وما تستوی والورد ساعۃ تفرع

میری بی بی مجھے اِس بات پر ملامت کرتی ہے کہ میں اُونٹنی کا تمام دُودھ اپنے گھوڑے ورد نامی کو پلا دیتا ہوں، حالانکہ لڑائی کے وقت وہ ورد کی برابری نہیں کر سکتی!

وتمت الیہ باللجام میسرا
ھنالک یجزینی بما کنت اصنع

اور جب میں آمادہ جنگ ہو کر اس کے مُنہ میں لگام پڑھاوں گا تو اس وقت وہ میری اِس حسنِ خدمت کا معاوضہ ادا کرے گا۔

اس کو سب سے زیادہ اپنی قوم محبوب ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے ذرا سے اشارہ پر اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

لایسألون اخاھم حین یندبھم
فی النائبات علی ما قال برھانا

جب ان کا بھائی ان کو فریاد رسی کے لیے بلاتا ہے تو وہ اس سے دلیل نہیں پوچھتے بلکہ مثلِ بجلی کی طرح اندھا دُھند ٹوٹ پڑتے ہیں!

وہ اپنے بچے کو اِس نظر سے پیار نہیں کرتا کہ وہ اس کے باغِ زندگی کا گُلِ رعنا ہے۔ بلکہ صرف اِس لیے کہ اس کی قوم کا ایک قوی البنیہ، صحیح الجسم، اور بہادر دسر فروش فرد ہے، اور اس لیے وہ بڑا ہو کر خود اس کے لیے نہیں، بلکہ اس کی محبوب و مطلوب قوم کے لیے ایک مفید فرد ہو گا:

وان عوار ان یکن غیر واضح
فانی احب الجون ذا المنکب العمم

میرا بیٹا عوار اگرچہ گورا چٹّا نہیں ہے لیکن میں تو اس کالے کلوٹے کو محبوب رکھتا ہوں، جس کے شانے

لمبے، چوڑے، اور قوی ہیں۔ یعنی قوم کی خدمت و نصرت کے لیے حسن و رعنائی نہیں، طاقت و توانائی کی ضرورت ہے۔

اگر کبھی صغیر السن بچے کی پرورش اُس کو میدانِ جنگ میں جانے سے روکتی ہے تو اس کو نہایت افسوس ہوتا ہے:

لولا بنیات کزغب القطا رددن من بعض الی بعض	اگر ریڈیوں کے بچوں کی طرح میری چھوٹی لڑکیاں نہ ہوتیں جن کی پرورش میرے بعد میرے رشتہ داروں میں بہ مشکل ہوگی تو:
کان لی مضرب واسع فی الارض ذات الطول والعرض	میرے لیے ایک فراخ میدان لمبی چوڑی زمین میں ہوتا، اور وہاں میں آزادانہ اپنی قوتوں کی نمائش کرتا۔
وانما اولادنا بیننا اکبادنا تمشی علی الارض	ہمارے بچے ہمارے لختِ جگر ہیں جو زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔

یہ اخلاقی جزئیات تھے۔ ان کے علاوہ کلی طور پر بھی جنگ ایک قوم کے نظامِ اخلاق کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا سلسلۂ اخلاق قائم کر دیتی ہے۔ جنگ کی وجہ سے انسان اپنے وطن سے نکل کر دُوسرے مُلکوں کے حدود میں قدم رکھتا ہے اور فاتحانہ ثمرات کی حرص اور ظفر مندانہ جاہ و اقتدار کا ولولہ اس کو وہیں روک لیتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ وہیں مستقل سکونت اختیار کر لیتا ہے اور اسی مُلک کے رسم و رواج کا پابند ہو جاتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تعلقات بڑھتے ہیں، اور اسی مُلک میں نکاح و ازدواج کا سلسلہ بھی قائم ہو جاتا ہے۔ اب جو اولاد ہوتی ہے، اُس کی رگوں میں خالص خون نہیں ہوتا۔

وہ دو عنصروں سے مرکب ہوتی ہے۔ اِس طرح بتدریج اختلاطِ نسب ہو جاتا ہے اور چند پشتوں کے بعد فاتح کا اصلی نسب نامہ بالکل گم ہو جاتا ہے۔

اِس اختلاطِ نسب کا صرف یہی نتیجہ نہیں ہوتا کہ ایک خاندان اپنے نام و نشان کو کھو دیتا ہے، بلکہ اس قبیلہ، اس خاندان اور اس مُلک کی تمام مخصوص اخلاقی خصوصیات فنا ہو جاتی ہیں۔ اور اُن کی جگہ ایک نیا نظام اخلاق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر دُنیا میں نسلی اور وطنی امتیازات کوئی مفید جوہر ہیں تو جنگی زندگی کی وسعت کا بلاشبہ یہ نقص ہے۔ لیکن اگر انسان کے لیے چاہیے کہ وہ تمام کرۂ ارضی کو اپنا وطن اور تمام انسانی نسلوں کو اپنا گھرانہ سمجھے، تو پھر یہ انسان کی وہ مشکل ترین متاع مطلوب ہے جو صرف جنگ ہی کی روشنی میں مل سکتی ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ مفتوح قوم پر ہمیشہ فاتح کی وضع لباس، اخلاق و عادات کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن ازدواجی تعلقات کی حالت میں ہمیشہ مفتوحہ قوم کی بی بی فاتح شوہر پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے اور اُس کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔

اہل عرب جب تک حدودِ عرب میں باہم سرگرم کارزار رہے ان کا نسب، اور نسب کے ساتھ اُن کا نظام اخلاق بھی محفوظ رہا لیکن ابتدائے اسلام میں جب اُن کے فاتحانہ حوصلوں نے حدودِ حجاز سے باہر قدم رکھا تو دفعۃً ان کی تمام عربی خصوصیات معدوم ہو گئیں۔ عرب جاہلیت کا سب سے بڑا مایۂ فخر یہ تھا کہ وہ اپنے نام و نسب کو از بر یاد رکھتے تھے، اور اپنے آپ کو فخریہ اپنے قبیلے کی طرف منسوب کرتے تھے۔ جب فتوحات اسلامیہ کا سیلاب دوسرے مُلکوں کی طرف بڑھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اختلاط نسب کا خطرہ پیدا ہوا۔ انھوں نے اہل عرب کو سخت تاکید کی کہ اپنے نام و نسب

کو یاد رکھو اور ملک شام کے دیہاتی نہ بن جاؤ کہ جب اُن سے اُن کا نام و نسب پوچھا جاتا ہے تو اپنے گاؤں کا نام بتاتے ہیں۔ لیکن فطرت سے کون جنگ کر سکتا ہے؟ آخرکار اختلاط نسب ہُوا، اور قبیلہ کے بجائے اب فوجیں ان مقامات کی طرف منسوب ہونے لگیں، جہاں جنگ کی ضرورت اور سرحد کی محافظت کے لیے وہ مقیم رہتی تھیں۔ عربی میں "جند" فوج کو کہتے ہیں۔ اسلام کے مفتوحہ ممالک کے نقشے میں متعدد نام اسی انتساب کے ساتھ مشہور ہیں۔ مثلاً جند قنسرین، جند دمشق، جند عواصم۔ ان ناموں نے اگرچہ عرب کی فوجی طاقت کے مستقل اثر کو اب تک زندہ رکھا ہے، لیکن اس ترکیب اضافی نے آگے چل کر عرب کے نام و نسب کو بالکل مٹا بھی دیا، اور نسب صریح جو نسلی اخلاق کی محافظت کرتا ہے، وہ بالکل معدوم ہو گئے۔

یہ ایک نہایت دینی و اجتماعی مبحث ہے کہ اسلام نے عرب جاہلیت اور تمام اقوام عالم کی نسلی حیثیت کو مٹا کر ایک عالم گیر اور بین الملی برادری قائم کی، لیکن اس کے ساتھ ہی جس قدر عمدہ خصائص قومی و نسلی زندگی میں ہو سکتے ہیں ان سب کو مذہبی رابطہ قائم کر کے مذہب کی بنا پر پیدا بھی کر دیا اور اس طرح وہ عمدہ خصائص قومی و ملکی حدود سے نکل کر، انسانیت کا عام جوہر بن گئے اس مبحث کو ابھی ہم نہیں چھیڑیں گے۔

لیکن فاتح ایک دوسری حیثیت سے مفتوح قوم کے اخلاق و عادات پر بھی اثر ڈالتا ہے۔ انسان صرف قوت ہی کے آگے سر جھکاتا ہے، اس لیے جب کوئی قوم اُس پر غالب آجاتی ہے تو اس کو فطرتاً اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہی خوش اعتقادی اس کو فاتح کی تقلید پر مجبور کرتی ہے، اور وضع، لباس،

اخلاق، عادات، نشست، برخاست، غرض ہر چیز میں فاتح ہی کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ اور اس طرح ایک عظیم الشان تمدنی اور اخلاقی انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔

تاریخ اسلام میں سینکڑوں واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے سیلاب نے بہت سی قوموں کو دفعتہ بالکل بدل دیا۔ ہندوستان میں ہیٹ کے نیچے جو چھپے ہوئے سرشتہ غرور تفریح و فرنگی مابل میں بدمست نظر آتے ہیں، جب اُن کو ہوش آئے گا تو معلوم ہو گا کہ وہ عقل و بصیرت کی جگہ ایک ایسا ذلیل ترین دماغ رکھتے ہیں جو در پردہ اپنے ضعف اور دوسری قوموں کی قوت کا مہلک اعتراف کر رہا ہے۔ بلکہ یہی انجذاب قومی ہے جو اُن کی جبین نیاز کو اکثر ان کی چوکھٹ پر جھکا دیا کرتا ہے۔

یہ انقلاب اگرچہ بظاہر اپنے اندر بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی دکھلاتا ہے، یعنی فاتح قوم کے دل و دماغ جن اعلیٰ جذبات سے لبریز رہتے ہیں، مفتوح قوم بھی انہیں کو جذب کرنا چاہتی ہے، لیکن سیلاب جب آتا ہے تو گوہر و مرجان سے زیادہ اپنے ساتھ خس و خاشاک کا ڈھیر بہا لاتا ہے اور اپنی یادگار میں اسی کو چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے۔ زمین کے حصے میں صرف یہی ڈھیر آتا ہے۔ اور ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جو صرف گوہر و مرجان سے اپنے دامن و جیب کو بھر لیتے ہیں۔

فاتحانہ حیثیت سے اخلاقی و تمدنی انقلاب بھی بالکل اسی طرح اضطراری طور پر ہوتا ہے، اس لیے انسان کی قوت انتخاب بالکل بے کار ہو جاتی ہے اور فاتح جو کچھ دے دیتا ہے، اسی کو جبراً قبول کر لینا پڑتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح قوموں کی تقلید میں سینکڑوں غیر ضروری، غیر مفید بلکہ مضر چیزیں اختیار کر لیتی ہے۔ اور خس و خاشاک کے ڈھیر میں صدف و گوہر بالکل چھپ جاتا ہے۔

فاتح قوم کی جو خوبیاں مفتوح قوم میں منتقل ہوتی ہیں اُن کا اثر صرف بہ چند مخصوص افراد ہی میں نمایاں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں کوٹ پتلون پہن کر چلنے پھرنے والے ہر سڑک پر نظر آ سکتے ہیں، لیکن انگریزوں کا سا اعلیٰ کیرکٹر اور قومی حریت تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی یکسر مفقود ہے۔

جنگ کے ذریعے سے بعض اوقات فاتح قوم میں بعض نہایت شرمناک بداخلاقیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فوج ایک مدت تک گھر سے باہر میدانِ جنگ میں اقامت گزیں رہتی ہے، زمانۂ جنگ میں اُس کے جذبات و قویٰ سخت ہیجان کی حالت میں رہتے ہیں، بدامنی اس کو بہت کچھ مطلق العنان بنا دیتی ہے۔ اِس لیے اس کے جذباتِ بہیمیہ سخت مُشتعل ہو جاتے ہیں، اور وہ اِس آگ کو ہر ممکن طریقے سے بجھانا چاہتی ہے۔ پس مفتوح قوموں کی ہر چیز حالتِ جنگ میں مُباح ہو جاتی ہے عرب میں مُتعہ کا رواج اِسی بنا پر ہو گیا تھا جس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم نے بتدریج مٹا دیا۔ ایرانیوں میں عشقِ رجال کا رواج اُنہی غلاموں کے ذریعے سے ہُوا جو لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آتے تھے۔ رفتہ رفتہ اُنھوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کر لی کہ فارسی لٹریچر کا ایک جُزوِ لاینفک بن گئے۔ جن کو اگر علیحدہ کر دیا جائے تو فارسی شاعری کا دامنِ حسن دفعتاً خالی ہو جائے!

ابتداء میں اہلِ عرب اِس مرض سے بالکل ناآشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم عربی شاعری کا دامن اِس داغ سے بالکل پاک نظر آتا ہے۔ لیکن جب اہلِ عرب کی فتوحات کا سیلاب بڑھا اور اسلام کے دامن میں بھی حلقہ بگوش غلام آ گئے تو ابتداء میں فوجی خیموں کے اندر ان کو دخل ہُوا پھر خلفاءِ عباسیہ کی بزمِ طرب کے شمع و چراغ ہو

گئے، یہاں تک کہ ابن معتز عباسی نے عربی شاعری کے دامن پر بھی اس داغ کو لگا دیا۔

عیش پرستی کی یہ آخری سرحد ہے، اور یہیں پہنچ کر ہر قوم فنا ہو جاتی ہے۔ آج جو لوگ عظیم الشان قوموں کی موت پر ماتم کر رہے ہیں، اُن کو صرف مادی طاقت ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیئے بلکہ اُن اخلاقی تغیرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو سطوت عامہ کے مجزولانیفک ہیں۔ اِس طرح کی حکیمانہ نگاہ سے ثابت ہو جائے گا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں۔ اُس زبردست طاقت کے سامنے مادی قوت نے ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ عرب کو اسی اخلاقی طاقت نے اُبھارا تھا اور اسی کے تنزل نے ان کو موجودہ گمنامی تک پہنچا دیا۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امرا۔

تربیت عسکریہ
اور
قرآن حکیم

اِنسان نہایت سرکش اور متمرد ہے۔ اس نے بارہا حقوق الٰہی میں دست اندازی کی ہے، اس کی عظمت و جبروت کے سراپردۂ جلال کو چاک چاک کرنا چاہا ہے، اِس کے دامنِ توحید پر چنگل مارا ہے، اور پتھروں بلکہ کنکریوں تک کو اُس کا شریک بنا دیا ہے۔

اس نے خدا کی پاکی و قدوسیت کو بھی اپنے انسانی جذبات کے ساتھ ملوث کرنا چاہا، اور اس کے صالح بندوں کو اُس کا بیٹا بنایا! سُبْحٰنَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا (۱۷)

اس نے کبھی کبھی غرور و تکبّر کے گھمنڈ میں آکر خود اپنا نسب نامہ بھی خدا کے ساتھ جوڑ دیا ہے، اور اس طرح اپنے خاندان کو تمام دُنیا سے اُونچا کرنا چاہا ہے!
تَعَالَی اللّٰهُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ!

اس نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں کو ساحر، مجنون، پاگل اور دیوانہ کہا ہے۔

اُن کو طرح طرح کی اذیتیں دی ہیں۔ اُن کے ساتھ ہر موقع پر گستاخی کی ہے، بلکہ کبھی کبھی خدا کے ان صالح بندوں کو قتل کر دیا ہے۔

لیکن اس سرکش کا خون اِس قدر گراں قدر، قیمت اور بیش بہا ہے کہ اس تمرّد و طغیان پر بھی خدا نے اس کی حُرمت کو قائم رکھا۔ لیکن جب سرکشی و عصیان نے بہت زیادہ سر اُٹھایا، اور خدا کے دائرہ عفو و کرم کے حدود سے آگے بڑھ گئی تو قانونِ تعذیب الٰہی کو بھی حرکت ہوئی، اور خدا نے ظالم قوموں پر اپنی عظیم الشان مخلوط کو مسلط کر دیا۔ آنکھوں نے اس کو بداعمالیوں کی پوری پوری سزا دی۔ ثمود کو زمین نے پیس کر غبار بنا دیا۔ عاد کو ہوا کے جھونکے خس و خاشاک کی طرح اُڑا لے گئے۔ قوم نوح کو طوفان کا ریلا تنکے کی طرح بہا لے گیا۔ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَاۤ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ؕ اِنَّ اَخْذَهٗۤ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ (۲۔۱)

حقوق العباد

لیکن بایں ہمہ خدا نے اپنے حقوق کی حفاظت و احترام کے لیے کبھی بھی ایک قطرۂ خون نہیں بہایا۔ خدا نے دُنیا کی بڑی بڑی متمرّد قوموں کو مٹا دیا، اُن کی نسل فنا کر دی، اُن کی یادگاروں کو برباد کر دیا، لیکن وہ جس سرزمین پر آباد تھے، اُس کے دامن پر خون کا ایک دھبہ بھی نظر نہیں آیا۔

البتہ جب انسان نے حقوق الٰہی کے حدود سے بھی آگے قدم بڑھایا اور خود اپنے بھائیوں کے فطری حقوق کو پامال کرنا چاہا، اُن کے مُلک چھین لیے۔ اُن کی آزادی و خود مختاری سلب کر لی۔ اُن کے بچوں کی نشو و نما روک دی۔ اُن کی زمینوں پر اپنے عیش و نشاط کے محل تعمیر کیے۔ اُن کے جسم سے نکلے ہوئے پسینے اور گردنوں

سے بہتے ہوئے خون سے اپنی تشنگیٔ ظلم کو تسکین دی، اور پوری قوم و ملک کو اپنی قومی سیادت و عظمت کے لیے ایک آلہ بیجان بنالیا تاکہ اپنی قدرتی حرکت کو چھوڑ کر صرف انہی کے اشاروں پر حرکت کریں، تو اس وقت خدا نے بھی شکنجۂ عذاب کو پہلے سے زیادہ سخت کیا، اور جو سیاستِ الٰہی پہلے سے قائم تھی اس کا رنگ بالکل بدل گیا۔ پہلے سیاستِ ربانی کا منصب صرف آسمان و زمین اور ابر و دریا کو حاصل تھا، جن کی عذاب کی چکی چند لمحوں کے اندر قوم کی قوم کو پیس ڈالتی تھی، مگر اب یہ خدمت خود انسان ہی کو، بلکہ صرف انسان کے ہاتھ کی دس انگلیوں کو سپرد کر دی گئی۔ انسان جب تک خدا کے حقوق کو پامال کر رہا تھا، خدا اپنی عظیم الشان مخلوقات کے ذریعے سے اُن کو عذاب دیتا تھا۔ اب خود انسان کے حقوق روندے جا رہے تھے، اس لیے خدا نے بھی انسانیت کی عزت و احترام کو قائم رکھنے کے لیے خود انسان ہی کو کھڑا کر دیا!

زمانہ وحشت میں انسان نے کتنے انسانوں کے حقوق پامال کیے ہوں گے! کتنی عورتوں کے سر سے چادرِ عصمت اُتار لی ہوگی؟ ان حقوق کے تحفظ کے لیے تلواریں بھی چمکی ہوں گی، تیروں نے بھی اپنی روانی دکھائی ہوگی، کمانوں کی چرچراہٹ کی آواز سے بھی وحشت کدۂ عالم گونج اُٹھا ہوگا۔ لیکن تاریخ نے ان واقعات کو یاد نہیں رکھا، وہ اس وقت موجود نہ تھی۔ اس لیے وہ بھی ان قوموں کے ساتھ جنگل کے تاریک گوشوں اور پہاڑوں کے تنگ غاروں میں گم ہوگئی۔ البتہ زمانہ تمدن کی تاریخ نے اس قسم کے سینکڑوں واقعات کو اب تک ازبر رکھا ہے، اور اس آموختہ کے یاد کرنے میں سب سے زیادہ زبانِ تیغ نے مدد دی ہے۔ خون کے دھبوں نے ان کے نقوشِ رنگین کو کبھی مٹنے نہیں دیا۔

DIVIDE AND RULE

تربیت عسکری کے لئے پہلی چیز ایک متحدہ قومیت کا پیدا ہونا ہے۔ محض انسانوں کی ایک بھیڑ سے متمدن فوج نہیں بن سکتی جب تک کہ قومیت کی روح ایک متحد جماعت پیدا نہ کردے۔ باہمی اتفاق و اتحاد کی زنجیریں سب کے پاؤں میں ہوں، کسی مقصد کے عشق اور ایک حکم کی اطاعت میں سب کے سب ایک بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو حکومتیں اپنے جبر و استبداد کے قائم کرنے کے لیے کسی قوم کے سپاہیانہ جذبات کو فنا کرنا چاہتی ہیں، وہ سب سے پہلے سیاسی فریب و دسائس کے ذریعے اس میں پھوٹ، نفاق، بغض، کینہ اور باہمی انتقام کے جذباتِ جیشنہ پیدا کر کے اُن کی جمعیت کو توڑ دیتی ہیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ ان کی قومیت فنا ہو جاتی ہے۔

لیکن اس خدع و فریب کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے، جب قوم میں کچھ لوگ بیدار دماغ، متحرک اعصاب، اور مضطرب دِل رکھتے ہوں اور سیاست کی چھپی ہوئی چالوں کے زہر آلود اثر سے متاثر ہوتے رہتے ہوں۔ لیکن جب کوئی قوم دل و دماغ کھو کر اپنے سرچشمۂ احساس کو بالکل فنا کر دیتی ہے، تو پھر ان فریب کاریوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بلکہ سر بازار تلوار سے اُس کے نقشِ وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا جاتا ہے۔

دُنیا کی مُلکی تاریخیں اِس قسم کی بہت سی مٹی ہوئی قوموں کو نمایاں کر سکتی ہیں، لیکن مذہبی تاریخ واقعات میں تسلسل و نظام اور ترتیب نہیں ڈھونڈھتی۔ وہ دُنیا کو محض عبرت کا افسانہ سُناتی ہے۔ اِس لیے وہ صرف ایک اہم اور کثیر النتائج واقعہ کا انتخاب کر لیتی ہے۔ جو تمام دُنیا کے لیے مجموعۂ حیرت ہوتا ہے، اور اس کو بار بار دُنیا کے آگے پیش کرتی رہتی ہے۔ اِس اصول کی بنا پر اُس نے ہم کو صرف فرعون

کے مظالم کی داستان سُنائی ہے، جس کا انتہائی ظلم و عدوان یہ تھا کہ وہ اپنی اجنبی رعایا کے اندر پھوٹ اور نااتفاقی ڈال کر حکومت کرتا تھا اور ایک گروہ کو ضعیف اور دوسرے کو قوی رکھتا تھا:

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (۲۸:۳۱)

فرعون نے خدا کی زمین میں بہت سر اُٹھایا اور اس کے رہنے والوں میں پھوٹ ڈال کر ان کو گروہ در گروہ کر دیا۔ وہ اُن میں سے ایک جماعت کو کمزور رکھتا اور اُبھرنے نہ دیتا۔

مذہبی حکومتوں کے سوا ظلم ہر دُنیوی سلطنت کا مایۂ خمیر ہے اور باوجود مختلف قسم کے مظالم کے وہ اپنی زندگی کے وہ دِن پورے کر لیتی ہیں جو خدا نے اُن کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ لیکن جب کوئی سلطنت ظلم کو اس انتہائی درجے تک پہنچا دیتی ہے کہ انسانی حقوق کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا تو یہ اُس کی زندگی کا آخری دِن ہوتا ہے اس وقت اس کا تاج و تخت اُلٹ دیا جاتا ہے اور وہ صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹادی جاتی ہے۔

آج بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدا کا یہ قانون کس طرح کام کر رہا ہے؟

ظلم کی موت ہی سے عدل پیدا ہوتا ہے۔

لیکن دُنیا پر یکے بعد دیگرے ہمیشہ متضاد قوتوں نے حکومت کی ہے۔ رات کے جانے کے بعد ہمیشہ دن جلوہ گر ہوا ہے، تاریکی کے بعد ہمیشہ روشنی چمکی ہے، سیاہی کے بعد ہمیشہ سفیدی نے ظہور کیا ہے۔ یہی حال حکومتوں اور سلطنتوں کا بھی ہے۔ جب ایک ظالم حکومت مٹتی ہے تو اس کی جگہ اُسی وقت ایک عادل سلطنت قائم ہو جاتی ہے ظلم کا جانا ہی عدل کے ظہور کا پیام ہے، اور رات اگر ختم ہو گئی

ہے تو اس کے یہی معنی ہیں کہ دن آگیا۔

جب جابرانہ قوموں کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تو ایک عادلانہ نظام قائم ہو جاتا ہے۔ فرعون کی جابرانہ سلطنت کا زوال ایک دوسری قوم کی عادلانہ حکومت کا مقدمہ تھا، اس لیے خدا نے فرعونیوں کی ہلاکت کے ساتھ ہی عدل الٰہی کے قیام کا بھی مژدہ سنا دیا:

وَنُرِيدُ أَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُمْ مَا كَانُوا يَحْذَرُونَ (۲۸: ۵)	اور ہم اپنے دائمی قانون عدل کی بنا پر چاہتے ہیں کہ جو لوگ ہماری زمین میں کمزور بنا کر ایک مدت تک رکھے گئے ہیں، اُن پر احسان کریں، اور اُن کو دنیا کی پیشوائی عطا فرمائیں، بڑی بڑی طاقتور قوموں کے تاج و تخت کے وہی وارث ہوں اور اُن کی

پادشاہت زمین پر قائم ہو جائے۔ فرعون و ہامان اور اُن کی قوم کو اُن کی طرف سے جس چیز کا کھٹکا تھا اور جس کے لیے وہ انھیں کمزور رکھتے تھے، وہی اُن کے سامنے لائیں گیا!

انقلاب قوت و ضعف

یہ سلطنت فرعونی کے انقلاب کی سرگذشت تھی۔ لیکن غور کرو کہ اِس آیت کریمہ کے اندر قرآن کریم نے کس طرح اپنے ایک قانون الٰہی کی خبر دے دی ہے؟ وُہ بتلاتا ہے کہ دُنیا قوت کے جاہ و جلال کی نمائش گاہ ہے اور کمزوروں کی ہلاکت کا مقتل ہے۔ طاقتور قومیں کمزوروں کو اپنا غلام و محکوم بناتی ہیں ان میں پھوٹ اور اختلاف ڈالتی ہیں، اُن کے مختلف فرقوں اور مختلف گروہوں کو باہم ملنے نہیں دیتیں، کیونکہ اگر وہ مل کر ایک ہو جائیں تو پھر کمزور نہ رہیں اور اتفاق و یگانگت کی طاقت ان ظالموں کا تخت و تاج الٹ دے۔ یہی حال مصر میں بنو اسرائیل کا تھا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی دُنیا کا ایک مُستثنیٰ قانون بھی ہے، اور خدا کے زبردست ہاتھ کی گاہ گاہ چمک جانے والی حرکت بھی ہوتی ہے۔ جب ظُلم اور طاقت کے شیطان کا غُرور حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ دُنیا طاقت والوں کی جگہ کمزوروں کا گھر بنادی جاتی ہے، اور وہی زمین جو کمزوروں کی قتل گاہ تھی، طاقت والوں کی تباہی و ہلاکت کا تماشا گاہ بن جاتی ہے، پس اُس دن چھوٹے بڑے کیے جاتے ہیں، اور بڑوں کو چھوٹا بنایا جاتا ہے۔ وہ کہ کمزور کر دیئے گئے تھے، وہ کہ بے کس اور بے نوا تھے، وہ کہ صرف رونے، ماتم کرنے، بے بسی کی چیخیں مارنے، اور لُٹنے لٹانے کے لیے تھے، وقت آتا ہے کہ احسانِ الٰہی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں، اور کمزوری کی جگہ طاقت کے لیے۔ بے کسی کی جگہ فرمانروائی کے لیے، رونے کی جگہ خوشیوں کے لیے، ماتم کی جگہ عیش و کامرانی کے لیے، اور لُٹنے کی جگہ لُوٹنے کے لیے، تمام عالم میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ قوتِ فرعونی کی جگہ، قوتِ موسوی کی تلوار آن کی آن میں دُنیا کو پلٹ دیتی ہے، اور صدیوں کی گری ہوئی قومیں پھر جاہ و جلالِ ربانی کے ظہور و قیام کے لیے دُنیا کی وارث اور خلیفہ بنادی جاتی ہیں۔

تربیتِ عسکری

لیکن جس طرح تلوار کی آخری حرکت کسی سلطنت کی شہ رگ کو کاٹ دیتی ہے، اِسی طرح اس کی پہلی جُنبش نظامِ حکومت کو بھی قائم کر دیتی ہیں۔ حکومت سیاست کا سرچشمہ ہے، اور سیاست کی پیاس ہمیشہ تلوار ہی کے پانی سے بجھی ہے
خدا تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کو فرعون کے تاج و تخت اُلٹنے اور بنواسرائیل کی حکومت قائم کرنے کے لیے ایک تیغِ برہنہ کی صورت میں نمایاں کرنا چاہتا تھا، اِس

لیے دیکھو کہ کس طرح اُن کو بچپن ہی سے میدانِ جنگ کے شدائد و مصائب برداشت کرنے کا خوگر بنایا اور طرح طرح کی آزمائشوں میں ڈال دیا؟ ابھی اُنھوں نے دُنیا میں پہلا ہی قدم رکھا تھا کہ ماں کے آغوشِ محبت سے جُدا ہو گئے اور جس آغوش کی محبت سے زمین پر رینگنے والے کیڑے بھی محروم نہیں رہتے، اللہ کی معلّمانہ مشیت نے اپنے رسول اولوالعزم کو اس سے محروم کر دیا۔ دریائے نیل کی طوفان خیز موجوں کی آغوش میں اُنھیں ڈال دیا گیا کہ ایک دن دریا کے طوفان ہی میں سے اُن کو اپنی راہ نکالنی تھی۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۸: ۷)

اور ہم نے موسٰی کی ماں کے دِل میں یہ بات ڈال دی کہ اس کو دُودھ پلائے، اور اگر فرعون کے کی وجہ سے اس کی جان کا خوف ہو، تو دریا میں ڈال دے اور کسی قسم کا خوف یا غم نہ کرے، ہم پھر اس کی گود میں اس کے لختِ جگر کو واپس کر دیں گے۔ اور اس کو اپنا پیغمبر بنائیں گے۔

حضرت موسٰی کی والدہ نے اپنے لختِ جگر کو دریا کی لہروں کی آغوش میں ڈال دیا۔ لیکن نیل کی لہریں اس امانتِ مقدس کو اور کہیں نہیں لے گئیں۔ اُسی کے محل تک بحفاظت پہنچا دیا جس کے سرِ غرور کو کچلنے کے لیے ایک دن یہ شیر خوار بچہ اُٹھنے والا تھا پھر محل فرعونی کی عورتوں کو ان پر مہربان کر دیا۔ انھوں نے اپنے بچوں کی طرح خاص شاہی محل کے اندر پرورش کی، اور اُن کی والدہ ہی اُن کی دایہ قرار پائیں۔ اِس میں اللہ کی بڑی مصلحت یہ تھی کہ حضرت موسٰی کی پرورش شاہی محل میں ہو گی تو بادشاہوں کے جاہ جلال باطل کا رُعب اُن کے دِل سے نکل جائے گا، اور بچپن ہی سے شاہانہ زندگی، سیاست و مُلک داری کے طریقے، اور ظالمانہ حکومتوں کے

تمام اسرار و خفایا اُن پر منکشف ہو جائیں گے ۔

فَالْتَقَطَهٗ آلُ فِرْعَوْنَ لِيَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا، اِنَّ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ (۲۸:۷)

پھر اس کو آل فرعون نے دریا سے نکال لیا، اور اس بچے کی پرورش کیا تاکہ آگے چل کر وہ ان کا دشمن اور سرمایۂ رنج و غم بنے۔ بے شک فرعون، ہامان، اور اُن کا لشکر غلطی پر تھا، جب کہ اپنے دشمن کو اپنے گھر کے اندر پال رہا تھا۔

آغاز کار

اِس کے بعد آزمائش و ابتلاء کے متعدد موقعے پیش آئے اُنھوں نے ایک ظالم شخص کو عین حالت ظلم میں قتل کر دیا:

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلٰنِ هٰذَا مِنْ شِيْعَتِهٖ وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِيْنٌ (۲۸:۱۴)

اور جبکہ تمام لوگ غافل تھے موسیٰ شہر میں آئے اور اس میں دو آدمیوں کو جھگڑتے ہوئے دیکھا ان میں ایک آدمی اُن کی قوم کا تھا اور دُوسرا اُن کے دُشمن کے گروہ کا۔ موسیٰ کو دیکھ کر اُن کی قوم کے آدمی نے دُشمن کے ظُلم کی فریاد کی۔ اور موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا کہ وہ مر گیا یہ حال دیکھ وہ گھبرائے کہ شیطان نے مجھے مصیبت میں پھنسا دیا۔ بے شک شیطان گمراہ کُن دشمن ہے۔

اب خدا نے ظُلم و فساد اور انسانی عبودیت و غلامی کی سرزمین سے ان کو دُور کرنا چاہا کیونکہ ضرورت تھی کہ وہ کسی آزاد مقام پر رکھ کر آنے والے وقت کے لیے تیار ہو جائیں۔

پس وہ نکلے اور ایک طرف خدا کی رہنمائی کے سہارے پر چل کھڑے ہوئے

وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَآءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یَّهْدِیَنِیْ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۲۸:۲۱) جب موسیٰ مصر سے نکل کر مدین کی طرف روانہ ہوئے تو کہا کہ خدا مجھ کو ضرور سیدھا راستہ دکھلائے گا۔

درسگاہ مدین

خدا نے اُن کی رہنمائی کی اور بطور مستقیم ان کو اپنے ایک صالح بندے کی آغوش تربیت میں ڈال دیا۔ وہاں اُنھوں نے کامل آٹھ سال تک آزادی کی ہوا میں اپنے جذبات حقہ و قواء صالحہ کو نشو و نما دی۔ پھر جب پلٹے تو فرعون کے تاج و تخت اُلٹنے کے لیے تمام ساز و سامانِ نصرت سے مسلح تھے۔

وَاَنْ اَلْقِ عَصَاكَ فَلَمَّا رَاٰهَا تَهْتَزُّ كَاَنَّهَا جَآنٌّ وَّلّٰى مُدْبِرًا وَّلَمْ يُعَقِّبْ يٰمُوْسٰٓى اَقْبِلْ وَلَا تَخَفْ اِنَّكَ مِنَ الْاٰمِنِيْنَ اُسْلُكْ يَدَكَ فِيْ جَيْبِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَيْكَ جَنَاحَكَ مِنَ الرَّهْبِ فَذٰنِكَ بُرْهَانٰنِ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ (۲۸:۳۱)

اور ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پھینک دو۔ موسیٰ نے اپنے ہاتھ سے عصا پھینک دیا، لیکن جب دیکھا کہ وہ سانپ کی طرح حرکت کر رہا ہے تو پُشت پھیر کر بھاگے اور پھر اس طرف رُخ نہ کیا۔ ہم نے کہا! اے موسیٰ! آگے بڑھو، مطلق خوف نہ کھاؤ تم محفوظ ہو گئے پھر ہم نے حکم دیا کہ اپنے ہاتھ کو گریبان میں ڈالو، وہ چمکتا ہوا نکلے گا تمہارے خدا کی طرف سے فرعون اور اُس کے ارکان سلطنت کے لیے یہ دو نشانیاں دی گئی ہیں۔

سپہ سالار جنگ

فوج کی تنظیم و تربیت کے لیے جس سپہ سالار کی ضرورت تھی وہ تمام آلات حرب سے مسلح ہو گیا، لیکن وہ جن لوگوں سے اپنی فوج مرتب کرنا چاہتا تھا وہ خود گرفتار

زندانِ مصیبت تھے اس لیے اُس نے پہلا مطالبہ جو فرعونی گورنمنٹ سے کیا وہ اسی فوج کی رہائی کا مطالبہ تھا،

اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ (۴۴:۱۷) خدا کے ان بندوں کو میرے حوالے کر دو میں تمہارے پاس ایک امانت دار پیغمبر بن کر آیا ہوں۔

داخلی تبلیغ

لیکن فرعون نے جیسا کہ تمام ظالم بادشاہوں کا طریقہ ہے، اُن کے اِس الٰہی مطالبے کو رد کر دیا۔ پس ضرور ہوا کہ اب کچھ دنوں تک مصر ہی میں رہ کر بنو اسرائیل کی تربیت و تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ اور صدیوں کی محکومی و غلامی نے جس درجہ اُن کے فوجی قویٰ کو معطل کر دیا ہے، اسی درجے کی قوی و مؤثر تعلیم کے ذریعے اُن میں حریت و استقلال کے عزائم پیدا کیے جائیں۔

پس حکمِ الٰہی کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی دعوت کی داخلی تبلیغ میں مشغول ہو گئے اور بنی اسرائیل کو آنے والے وقت کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ اِس تیاری کا طریقہ اور اس کے اصول جو قرآن حکیم نے بتلائے ہیں، ہم کسی دوسری صحبت میں ان کی طرف متوجہ ہوں گے۔

پہلی فوجی نمائش

جب ایک اچھی مدت اِس پر گذر گئی تو حکمِ الٰہی ہوا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس تیار کردہ فوج کی حرکت شروع ہو جائے۔ پس پہلی منزل یہ ہے کہ اب فرعونی گورنمنٹ کے ساز و سامان اور احکام و قوانین کی بالکل پروا نہ کرو۔ وہ بنو اسرائیل کو اپنی غلامی سے نکلنے نہیں دیتی، مگر تم اس کو اپنے ساتھ لے کر راتوں رات نکل کھڑے ہو۔

تمہارا تعاقب کیا جائے گا، لیکن عذابِ الٰہی بھی اُس کے تعاقب سے غفلت نہیں کرے گا:

فَأَسْرِ بِعِبَادِي لَيْلًا إِنَّكُم مُّتَّبَعُونَ (۲۲ : ۲۴) — میرے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ، کیونکہ تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔

اُنھوں نے حکمِ الٰہی کی تعمیل کی، اور اس طرح فوج کے لیے جس اجتماع و انضمام کی ضرورت ہوتی ہے اس کا قوام تیار ہو گیا۔

رُوحِ عسکری

لیکن فوج صرف آدمیوں کی اُس صف ہی کا نام نہیں ہے جو میدانِ جنگ میں دیوار کی طرح کھڑی کر دی جاتی ہے بلکہ جس طرح دُنیا کی ہر حقیقت مادہ و قوت سے مرکب ہے اسی طرح فوج بھی جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ رُوح تلواروں کے چمکتے ہوئے جوہر میں نہیں مل سکتی، اس کا آشیانہ شہسواروں کے خود میں نہیں ہے: وہ حلقہ دار زرہ کے جال میں مُرغِ رشتہ بپا کی طرح گرفتار نہیں ہے، اس نے ان تمام قیود سے آزاد ہو کر صرف سپاہیوں کے دِل ہی کو اپنا گھر بنایا ہے۔ اِسی گوشے میں اس کی مُعجزانہ طاقت کی کار فرمائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ فوج کی تعداد کی کمی بیشی سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایک سو اور ایک ہزار کے اختلاف سے اس کی حقیقت بدل نہیں جاتی۔ سامانِ جنگ کے عدم و وجود کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ چاہے تو ایک انسان کے اندر چمک کر اُسے ایک ہزار انسانوں پر غالب کر دے:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ — اے پیغمبر مُسلمانوں کو جہاد کے لیے اُبھارو۔ اگر تم میں سے بیس آدمی بھی صابر ہوں گے تو وہ دو سو دشمنوں

صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ پر غالب آجائیں گے اور تم میں سو آدمی بھی صبر کی طاقت
مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ ۔ رکھتے ہوں گے تو کفار کی ایک ہزار جمعیت پر غلبہ حاصل کر
کَفَرُوْا بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ لیں گے۔

عزم و استقلال اور صبر و توکّل کی طاقت صرف افراد کی کثرت سے پیدا نہیں ہو سکتی، اس کو آزادی کی زندگی ہی پیدا کرتی ہے جو قواء انسانی کی نشو و نما کی فطرتی تربیت گاہ ہے۔ لیکن آزادی ایک ایسا جوہر ہے، جو کبھی اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ ہر ریگستان کے چمکتے ہوئے ذرّے میں مل سکتا ہے، اور کبھی اِس قدر گراں قیمت ہو جاتا ہے کہ صرف تاج شاہی کے ٹکے ہوئے موتیوں ہی میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جس فوج کی تعلیم و تربیت کے لیے خدا کی طرف سے مامور ہوئے تھے، اس کے یہ جوہر یک قلم مفقود ہو گیا تھا۔ فرعون کی غُلامی نے اس کے تمام شریفانہ جذبات فنا کر دئے تھے۔ اس نے کبھی حکومت کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ دعوت کی طاقت نے مومنین بالغیب کا ایک چھوٹا سا گروہ ضرور پیدا کر دیا جس نے حریت صادقہ کی رُوح سے معمور ہو کر فرعون کو للکارا تھا:

فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ اِنَّمَا تَقْضِیْ جو حکم چاہو ہمارے لیے دو، تمہاری حکومت زیادہ سے
ھٰذِہِ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا (۷۵) زیادہ اِس دُنیوی زندگی ہی کا فیصلہ کر سکتی ہے
کہ ہمیں قتل کر دے۔ اس سے زیادہ تُم اور کیا کر سکتے ہو؟

لیکن یہ بھی صرف نُورِ ایمان کی ایک جدید رُوح کی صدا تھی جس نے غلاموں کے مُلک میں حریت حقّہ کا غلغلہ بلند کر کے ایک نمونہ قائم کر دیا۔ ورنہ بنو اسرائیل کے

حلقے سے کبھی اِس قسم کی صدائیں بلند نہیں ہو سکتی تھیں :

جہاد فی سبیل اللہ سے اعراض

پس اِس بناء پر بنو اسرائیل کی فوجی تعلیم و تربیت کے لیے وہی قُدرتی مرکز موزوں تھا، جہاں انسان نے سب سے پہلے آزادی کی ہوا کھائی ہے، یعنی آبادیوں اور بستیوں سے الگ کوئی صحرا اور میدان، جہاں نہ کسی کی حکومت ہو، نہ کسی انسان کا حکم۔ آزاد چڑیوں کے غول ہوں اور خود مُختار پرندوں کے جُھنڈ، اِسی کائنات فطری و حقیقی میں رہ کر وہ اپنی گُم شدہ حریت کو تلاش کر سکتے تھے جو مصر کی آبادی میں کھو گئی تھی!

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے پہلے آنے والے جاہ و جلال و عظمت کو یاد دلا کر اُن کے جذبۂ شجاعت کو تازہ کرنا چاہا:

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ (۵ : ۱۳)	جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے لوگو خدا کی نعمتوں کو دیکھو، اُس نے تم میں پیغمبر پیدا کئے تھے، اب تم کو بادشاہ بناتا ہے، اور وہ عظمت عطا فرماتا ہے جو اب تک کسی کو بھی نہ دی تھی۔ پس عزم اور ہمّت کرو، اور ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ اس کی حکومت صرف تمہاری ہی قسمت میں لکھ دی گئی ہے۔ اور ہرگز بزدلوں کی طرح پیٹھ پھیرو۔ اس کا نتیجہ بجز ناکامیابی و محرومی کے کچھ نہ ہوگا۔

لیکن یہ امتحان ایک ایسی قوم کے لیے سُود مند نہ ہو سکا جو صدیوں سے غلامی کی لعنت میں گرفتار تھی۔ بنو اسرائیل کی بُزدلی نے نہایت مایوسانہ جواب دیا:

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ (۵:۲۵)

ان لوگوں نے جواب دیا کہ موسیٰ! ارض مقدس میں ایک نہایت ہیبت ناک قوم رہتی ہے، ہم اس میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتے وہ اپنے ساز و سامان اور طاقت سے ہمیں پیس ڈالیں گے۔ جب تک وہ ملک سے خود بخود نہ ہٹ جائیں ہم اس کا رُخ نہ کریں گے۔

اِس داخلے سے محض شاہی جاہ و جلال کا منظر دکھانا مقصود نہ تھا بلکہ قدیم بنو اسرائیل کی کھوئی ہوئی عظمت کو خلافتِ الٰہی کی صورت میں قائم کرنا تھا، اور خلافتِ الٰہی کے قائم کرنے کے لیے جس قسم کی شجاعت درکار ہوتی ہے، اِس کو صرف نورِ ایمان ہی قائم کر سکتا تھا۔ بنو اسرائیل کے دل اس کی حرارت سے خالی تھے دو مخلص مومنوں نے اپنے نورِ ایمان کی حرارت سے اُن کے دلوں کو گرمانا چاہا:

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۵:۲۰)

جو لوگ بیت المقدس میں جانے سے ڈرتے تھے، انھیں میں سے دو آدمیوں نے جن پر خدا نے نورِ ایمان کے ذریعے احسان کیا تھا کہا جہاد فی سبیل اللہ سے انکار نہ کرو اور اللہ پر اعتماد کر کے ارضِ مقدس میں داخل ہو جاؤ۔ جب اس کے اندر داخل ہو جاؤ گے تو تم یقیناً غالب ہو گے۔ اگر تم مسلمان ہو تو خدا پر بھروسہ کرو۔

لیکن اِس پر بھی اُن کے دلوں میں حرارت پیدا نہ ہوئی اور انھوں نے صاف جواب دے دیا۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا اَبَدًا

ان لوگوں نے کہا: اے موسیٰ! جب تک وہ طاقتور

مَا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۔ (۵:۲۴)

لوگ اِس شہر میں ہیں ہم ہرگز اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔ تم اپنے خدا کے ساتھ جا کر لڑو، ہم اس جگہ بیٹھ کر تماشا دیکھیں گے۔

چہل سال قیام صحراء

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بالکل مایوسی ہو گئی، اور اُنھوں نے اِس بُزدل قوم سے علیحدہ ہونا چاہا؛

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَ اَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ (۵:۲۸)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: خداوندا! میں صرف اپنے وجود پر اپنے بھائی ہارون ہی پر اختیار رکھتا ہوں، اپنی قوم کی بُزدلی اور روحانی موت کو کیا کروں؟ اب مجھ میں اور اِس بدکار قوم میں علیحدگی کر دے۔

لیکن حکم الٰہی ہوا کہ اے موسیٰ! تم مایوسی کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہو، تمھاری پیغمبرانہ استقامت کی حالت کو ان مشکلوں کا مقابلہ کرنا چاہیے بنی اسرائیل کو مدتوں کی غلامی نے جہاد فی سبیل اللہ کی مقدس راہ سے ناآشنا کر دیا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی راحتوں کے عاشق ہیں، بڑے مقصد کی راہ میں مصیبت اُٹھانے سے جی چُراتے ہیں۔ غلامی کی زندگی کا یہ لازمی نتیجہ ہے پس اس سے نہ گھبراؤ اور انھیں یہاں سے نکال کر کسی آزاد و بے قید صحرا میں جا بساؤ۔ وہاں کی خالص اور فطری آب و ہوا میں ایک زمانہ بسر کریں۔ عہد غلامی کی پروردہ یافتہ نسل مٹ جائے۔ ایک نئی مستعد نسل پیدا ہو، پھر وہ راہ جہاد کی مشکلات کو برداشت کر سکے گی:

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْأَرْضِ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ- (۵:۲۹)

خدا نے کہا، بیت المقدس کا داخلہ اُن کے لیے چالیس سال تک حرام ہو گیا، اب اسی سرزمین میں وہ سرگرداں رہیں گے (سو اِل غلت میں یہ چہل سالہ تاخیر انہی کی بُزدلی کا نتیجہ ہے) پس ایسے لوگوں کی محرومی پر تمھیں افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔
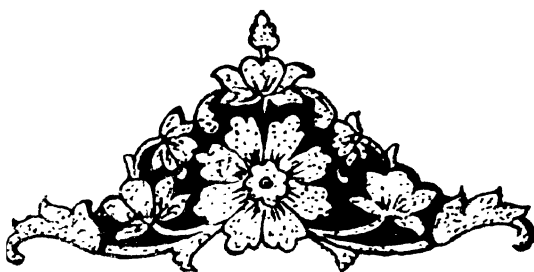
تاریخ و عبر

ماہ ربیع الاوّل

اور جشن تذکار

ولادتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بر دار تواں گفت بہ منبر نہ تواں گفت

ربیع الاوّل کا ورود تمہارے لیے جشن و مسرت کا ایک پیغام عام ہوتا ہے۔ کیونکہ تم کو یاد آجاتا ہے کہ اِسی مہینے کے ابتدائی ہفتوں میں خدا کی رحمت عامہ کا دُنیا میں ظہور ہُوا، اور اسلام کے داعی برحق کی پیدائش سے دُنیا کی دائمی غم گینیاں اور سرگشتگیاں ختم کی گئیں صلی اللہ وعلی آلہ وصحبہ وسلم

تم خوشیوں اور مسرتوں کے دلولوں سے معمور ہو جاتے ہو تمہارے اندر خدا کے رسول برحق کی محبت و شیفتگی ایک بے خودانہ جوش و محویت پیدا کر دیتی ہے۔ تم اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اُسی کی یاد میں، اُسی کے تذکرہ میں اور اُسی محبت کے لذت و سُرور میں بسر کرنا چاہتے ہو!

تم اُس کے ذکر و فکر کی مجلسیں منعقد کرتے ہو اُن کی آرائش و زینت میں اپنی محنت و مشقت کی کمائی بے دریغ لٹاتے ہو، خوشبودار اور تر و تازہ پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو۔ کافوری شمعوں کے خوبصورت فانوس اور برقی روشنی کے بکثرت کنول روشن کرتے ہو، عطر و گلاب کی مہک اور اگربتیوں کا بخور جب ایوان مجلس کو اچھی طرح معطّر کر دیتا ہے، تو اس وقت مدح و ثنا کے زمزموں اور درود و سلام کے مقدس ترانوں کے اندر اپنے محبوب و مطلوب مقدّس کی یاد کو ڈھونڈھتے ہو، اور بسا اوقات تمہاری آنکھوں کے آنسو اور تمہارے پُر محبت دلوں کی آہیں اس کے اسم مبارک سے والہانہ عشق سے حیاتِ روحانی حاصل کرتی ہیں!

پس کیا مُبارک ہیں وہ دِل جنھوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے ربّ السّمٰوٰت والارض کے محبوب کو چُنا! اور کیا پاک و مطہر ہیں وہ زبانیں جو سیّد المرسلین و رحمۃ العالمین کی مدح و ثنا میں زمزمہ سنج ہوئیں!

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند!

انھوں نے اپنے عشق و شیفتگی کے لیے اس کی محبوبیت کو دیکھا جس کو خود خدا نے اپنی چاہتوں اور محبتوں سے ممتاز کیا، اور اُن کی زبانوں نے اس کی مدح و ثنا کی جس مدح و ثنا میں خود خدا کی زبان، اُس کے ملائکہ اور قدوسیوں کی زبان، اور کائناتِ ارضی کی تمام پاک روحوں اور سعید ہستیوں کی زبان، اُن کی شریک و ہم نوا ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

کائناتِ ہستی کی محبوبیت اعلیٰ

بلاشبہ محبتِ نبوی اور عشقِ محمدی کے یہ پاک ولولے اور یہ مخلصانہ ذوق و شوق تمہاری زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی متاع ہے، اور تم اپنے ان پاک جذبات کی جتنی بھی حفاظت کرو کم ہے۔ تمہارا یہ عشقِ الٰہی ہے، تمہاری یہ محبت ربانی ہے، تمہاری یہ شیفتگی انسانی سعادت اور راست بازی کا سرچشمہ ہے تم اُس وجودِ مقدس و مطہر کی محبت رکھتے ہو جس کو تمام کائنات انسانی میں سے تمہارے خدا نے ہر طرح کی محبوبیتوں اور ہر قسم کی محمودیتوں کے لیے چن لیا، اور محبوبیّت عالم کا خلعت اعلیٰ صرف اسی کے وجودِ اقدس پر راست آیا۔ کرۂ ارضی کی سطح پر انسان کے لیے بڑی سے بڑی بات جو لکھی جا سکتی ہے، زیادہ سے زیادہ عشق جو کیا جا سکتا ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ مدح و ثنا جو کی جا سکتی ہے، غرض کہ انسان کی زبان انسان کے لیے جو کچھ کہہ سکتی اور کر سکتی ہے وہ سب کا سب صرف اسی ایک انسان کامل و اکمل کے لیے ہے اور اس کا مستحق اس کے سوا کچھ بھی نہیں:۔

مقصود ما ز دیر و حرم جز حبیب نیست

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

وَلِلّٰہِ دَرُّ مَا قَالَ

عباراتنا شتی وحسنك واحد

وكل الى ذاك الجمال يشير

وحدہٗ لاشریک

خدا کی الوہیت و ربوبیت جس طرح وحدہٗ لاشریک ہے کہ کوئی ہستی اُس کی

شریک نہیں، اِسی طرح اس انسان کامل کی انسانیت اعلیٰ اور عبدیت کبریٰ بھی وحدہٗ لاشریک ہے کیونکہ اس کی انسانیت وعبدیت میں کوئی اُس کا ساجھا نہیں، اور اُس کے حُسن وجمال فردانیت کا کوئی شریک نہیں:

منزہ عن شریک فی محاسنہ

فجوھر الحسن فیہ غیر منقسم

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں تم دیکھتے ہو کہ تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا گیا، وہاں ان سب کو اُن کے ناموں سے پکارا ہے، اور اُن کے واقعات کا بھی ذِکر کیا ہے تو اُن کے ناموں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اس انسانِ کاملؐ اس فرد اکملؐ، اس صفات عبدیت کے وحدہٗ لاشریک کا اکثر مقامات میں اِس طرح ذِکر کیا ہے کہ نہ تو اُس کا نام لیا گیا، نہ ہی کسی دُوسرے وصف سے نامزد کیا گیا، بلکہ صرف "عبد" کے لفظ سے اُس کے پروردگار نے اُسے یاد فرمایا:

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا۔

کیا پاک ہے وہ خداوند قدوس جس نے ایک رات اپنے "عبد" کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی!

سورۂ جن میں فرمایا:

وَاَنَّہٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰہِ یَدۡعُوۡہُ کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡہِ لِبَدًا۔

اور جب اللہ کا بندہ (عبد) تبلیغ حق کے لیے کھڑا ہوتا ہے تاکہ اللہ کو پکارے، تو کفار اس کو اس طرح گھیر لیتے ہیں گویا قریب ہے کہ اس پر آگریں گے!

سورۂ کہف کو اس آیت سے شروع کیا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ۔ تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے "عبد" پر کتاب اُتاری۔

سورۂ فرقان کی پہلی آیت ہے۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا کیا ہی پاک ذات ہے اُس کی جس نے "الفرقان" اپنے "عبد" پر اُتارا تاکہ وہ تمام عالم کی ضلالتوں کے لیے ڈرانے والا ہو!

اسی طرح سورۂ نجم میں کہا: فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی حدید میں کہا: یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِہٖٓ اٰیٰتٍ پس ان تمام مقامات میں آپ کا اسم گرامی نہیں لیا۔ بلکہ اس کی جگہ صرف "عبد" فرمایا۔ حالانکہ بعض دیگر انبیاء کے لیے اگر عبد کا لفظ فرمایا ہے تو اُس کے ساتھ نام کی تصریح بھی کر دی ہے۔ سورۂ مریم میں حضرت ذکریا کے لیے فرمایا: ذِکْرُ رَحْمَۃِ رَبِّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیَّا سورہ ص میں فرمایا۔ وَاذْکُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ۔ نیز وَاذْکُرْ عَبْدَنَآ اَیُّوْبَ

اس خصوصیت و امتیاز سے اسی حقیقت کو واضح کرنا مقصود الٰہی تھا کہ اس وجود گرامی کی عبدیت اور بندگی اس درجہ آخری و مرتبۂ قصویٰ تک پہنچ چکی ہے جو انسانیت کی انتہا ہے، اور جس میں اور کوئی عبد اس عبد کامل کا شریک و سہیم نہیں۔ پس عبدیت کا فرد کامل وہی ہے، اور اس لیے بغیر اضافت و نسبت کے صرف "عبد" کا لقب اس کو ناموں اور علموں کی طرح پہنچوا دیتا ہے۔ کیونکہ تمام کائنات ہستی میں اُس کا سا اور کوئی عبد نہیں:

پس یہ وہ تھا کہ اس کے صفات الٰہیہ کا یہ حال ہے۔ اس کی انسانیت و عبدیت

کی وحدت اس طرح فرمانفرمائے جمیع کائنات ہے، اس کی محبت و محبوبیت کا خود رب السموات والارض نے اعلان کیا اور اس کی رحمت کو اپنی ربوبیت کی طرح تمام عالمین پر محیط کر دیا، اس کو اللہ نے اپنی صفات رافت و رحمت سے متصف فرمایا اور اگر اپنے آپ کو الرحمٰن الرحیم کہا تو اُسے بھی: بالمومنین رؤف الرحیم قرار دیا۔ اس کو تمام قرآن حکیم میں کبھی بھی نام لے کر نہ پکارا، بلکہ کبھی صلائے عزت سے نوازا کر یا ایہا الرسول اور کبھی طریق محبت سے پکارا کر یا ایہا المزمل! اس کے وجود کی عزت و عظمت کو اپنی عزت کی طرح اپنے بندوں پر فرض کر دیا اور جا بجا حکم دیا کہ تعزروہ وتوقروہ (اس کی عزت کرو اور اس کی توقیر بجالاؤ) پھر وہ کہ اس کی محبوبیتوں اور عظمتوں کا یہ حال تھا کہ اس کا وجود مقدس و اطہر تو بڑی چیز ہے، وہ جس آبادی میں بسا اور جس شہر کی گلیوں میں چلا پھرا اس کی عزت کو بھی خدائے زمین و آسمان نے تمام عالم میں نمایاں کیا۔

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ — ہم مکہ کی قسم کھاتے ہیں مگر اس لیے کہ تیرا وجود اس کی سرزمین میں رہا اور بسا ہے۔

ومن مذہبی احب البلاد لاھلہا
وللناس فیما یعشقون مذاہب

پس جس کی قدوسیت و جبروتیت کا یہ مرتبہ ہو اُس کی یاد میں جتنی گھڑیاں بھی کٹ جائیں، اس کے عشق میں جتنے آنسو بہہ جائیں اس کی محبت میں جتنی آہیں بھی نکل جائیں اور اس کی مدح و ثنا میں جس قدر بھی زبانیں زمزمہ پیرا ہوں، انسانیت کا حاصل، روح کی سعادت، دل کی طہارت، زندگی کی پاکی، اور ربانیت و الاہیت کی

پادشاہی ہے۔ وَلِلّٰہِ دَرُّ مَا قَالَ

راہ تو بہرِ قدم کہ پوئید خوش است
وصل تو بہرِ سبب کہ جوئید خوش است
روئے تو بہر دیدہ کہ بینند نکوست
نام تو بہر زباں کہ گویند خوش است

جشنِ حصول و ماتمِ ضیاع

لیکن جبکہ تم اس ماہ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو اور اس ماہ کے واقعہ ولادت کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو، تو اُس کی مسرتوں کے اندر تمہیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے جس کے بغیر اب تمہاری کوئی خوشی نہیں ہو سکتی؟ کبھی تُم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے کہ یہ کس کی پیدائش ہے جس کی یاد کے لیے تم سر و سامان جشن کرتے ہو؟

یہ کون تھا جس کی ولادت کے تذکرہ میں تمہارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا

آہ! اگر اس مہینے کی آمد تمہارے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے، کیونکہ اسی مہینے میں وُہ آیا جس نے تم کو وہ سب کچھ دیا تھا، تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینے میں ماتم نہیں، کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے نے جو کچھ ہمیں دیا تھا، وہ سب کچھ ہم نے کھو دیا۔ اِس لیے اگر یہ ماہ ایک طرف بخشنے والے کی یاد تازہ کرتا ہے، تو دوسری طرف کھونے والوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیے:

ما خانہ رسیدگان ظُلمیم
پیغام خوش از دیار نیست

تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو، مگر تمہیں اپنے دل کی اُجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو، مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دُور کرنے کے لیے کوئی چراغ نہیں ڈھونڈھتے؟ تم پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو، مگر آہ، تمہارے اعمال حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے، تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومالِ بیتقیہ کو معطر کرنا چاہتے ہو، مگر تمہیں [illegible] غفلت کہ تمہاری عظمتِ اسلامی کی عطر بیزی سے دُنیا کی مشامِ رُوح یکسر محروم ہے! کاش تمہاری مجلسیں تاریک ہوتیں، تمہارے مایہ اینٹ اور چُونے کے مکانوں کو زیب و زینت کا ایک ذرہ نصیب نہ ہوتا، تمہاری آنکھیں رات رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، تمہاری زبانوں سے مولدِ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دُنیا کچھ نہ سُنتی، مگر تمہاری رُوح کی آبادی معمور ہوتی، تمہارے دل کی بستی نہ اُجڑتی، تمہارا طالعِ خُفتہ بیدار ہوتا، اور تمہاری زبانوں سے نہیں مگر تمہارے اعمال کے اندر سے اسوۂ حسنہ نبوی کی مدح وثنا کے ترانے اُٹھتے: فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

پھر آہ وہ قوم، اور صد آہ اس قوم کی غفلت و نادانی، جس کے لیے ہر جشن و مسرت میں پیامِ ماتم ہے اور جس کی حیاتِ قومی کا ہر قہقہہ عیش فغانِ حسرت ہو گیا ہے، مگر نہ تو ماضی کی عظمتوں میں اس کے لیے کوئی منظرِ عبرت ہے، نہ حال کے واقعات و حوادث میں کوئی پیامِ تنبیہ و ہوشیاری ہے، اور نہ مستقبل کی تاریکیوں میں زندگی کی کسی روشنی کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اسے بس نام جھنڈیوں اور جشن و مسرت کی

بزم آرائیوں سے مہلت نہیں، حالانکہ اس کے جشن و طرب کے ہر دردد میں ایک نہ ایک پیام ماتم و عبرت بھی رکھ دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ آنکھیں دیکھیں، کان سُنیں اور دل کی دانائی غفلت و سرشاری نے نہ چھین لی ہو: وَاِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔

ظہور و مقصد ظہور

ماہ ربیع الاوّل کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرّت کا پیام اِس لیے تھا کہ اسی مہینے میں خدا کا وہ فرمانِ رحمت دُنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا۔ ظُلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں۔ خدا اور اُس کے بندوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ جُڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دُشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا۔ اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی بادشاہت کا اعلانِ عام ہُوا،

لَقَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ	اللہ کی طرف سے تمہاری جانب ایک نُورِ ہدایت
كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۔ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ	اور کتاب مبین آئی۔ اللہ اس کے ذریعے اپنی رضا
مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ	چاہنے والوں کو سلامتی اور زندگی کی راہوں پر ہدایت
السَّلٰمِ	کرتا اور ان کے آگے صراطِ مستقیم کو کھولتا ہے!

لیکن دُنیا شقاوت و حرمانی کے درد سے پھر دُکھیا ہو گئی، انسانی شر و فساد اور ظُلم و طغیان کی تاریکی خدا کی روشنی پر غالب ہونے کے لیے پھیل گئی۔ سچائی اور راست بازی کی کھیتیوں نے پامالی پائی، اور انسانوں کے لیے راہ گلہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔ خدا کی وہ زمین جو صرف خدا ہی کے لیے تھی غیروں کو دے دی گئی، اور اس کے

کلمۂ حق و عدل کے غم گساروں اور ساتھیوں سے اس کی سطح خالی ہو گئی:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ
زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسان کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا اور زمین کی صلاح و فلاح غارت ہو گئی،

پھر آہ! تم اُس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو، پر اُس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہو گئے ہو، اور وہ جس غرض کے لیے آیا تھا، اس کے لیے تمہارے اندر کوئی ٹیس اور چبھن نہیں؟

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمہارے لیے خوشبوؤں کی بہار ہے تو صرف اِس لیے کہ اسی مہینے میں دُنیا کی خزاں و ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہُوا۔ پھر اگر آج دُنیا کی عدالت سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے، تو غفلت پرستو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔

آتشیں شریعت

اِس موسم کی خوشیاں اِس لیے تھیں کہ اسی میں اللہ کی عدالت کی وہ "آتشیں شریعت" کوہ فاران پر نمودار ہوئی، جس کی سعیر کی چوٹیوں پر صاحب تورات کو خبر دی گئی تھی، اور جو مظلومی کے آنسو بہانے، مسکینی کی آہیں نکالنے، ذلت و نامرادی سے ٹھکرائے جانے کے لیے دُنیا میں نہیں آئی تھی، بلکہ اس لیے آئی تھی تاکہ اعدائے حق و عدالت ناکامی کے آنسو بہائیں، دُشمنانِ الٰہی مسکینی کے لیے چھوڑ دیئے جائیں، ضلالت و شقاوت نامرادی و ناکامی کی ذلت سے ٹھکرائی جائے اور سچائی و راستی کا عرشِ عظمت و

اجلال نصرت الٰہی کی کامرانیوں اور اقبال و فیروزی کی فتح مندیوں کے ساتھ تمام کائناتِ ارضی میں اپنی جبروتیت و قدوسیت کا اعلان کرے۔ پس وہ اللہ کے ہاتھ کی چمکائی ہوئی ایک تلوار تھی، جس کی ہیبت و قہاریت نے باطل پرستی کی تمام طاقتوں کو لرزا دیا اور کلمہ حق کی بادشاہت اور دائمی فتح کی دُنیا کو بشارت سُنائی:

هُوَ الَّذِيٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ

وہ خدا ہی ہے جس نے اپنے رسول کو دُنیا کی سعادت کے قیام اور ضلالت کی مقہوریت کے لیے دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ وہ تمام دینوں پر اُسے غالب کر دے پس اُس کی حقانیت کی طاقت ہی آخر میں دائمی اور تمام فتح پانے والی ہے۔ اگرچہ مشرکوں پر ایسا ہونا بہت ہی شاق گذرے۔

وُہ ذلت کا زخم نہ تھا، بلکہ نامرادی کا زخم لگانے والا تھا، وہ مظلومی کی تڑپ نہ تھی بلکہ ظالم کو تڑپانے والی شمشیر تھی، وہ مسکینی کی بیقراری نہ تھی، بلکہ دُنیا کو بیقرار کرنے والوں نے اس سے بیقراری پائی۔ وُہ درد و کرب کی کروٹ نہ تھی بلکہ درد و کرب میں مبتلا کرنے والوں کو اس سے بے چینی کا بستر مِلا۔ وہ جو کچھ لایا اس میں غمگینی کی چیخ نہ تھی، ماتم کی آہ نہ تھی، ناتوانی کی بے بسی نہ تھی، اور حسرت و مایوسی کا آنسو نہ تھا، بلکہ یکسر شادمانی کا غلغلہ تھا، جشن و مُراد کی بشارت تھی، کامیابی و عیش فرمائی کی بہار تھی، طاقت اور فرمان فرمائی کا اقبال تھا، اُمید اور یقین کا خندۂ عیش تھا، زندگی اور فیروزمندی کا پیکر و تمثال تھا: فتح مندی کی ہمیشگی تھی، اور نصرت و کامرانی کی دائمی:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا اللہ کے وہ صالح بندے جنھوں نے دُنیا کی تمام

تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ

طاقتوں سے کٹ کر کہا کہ اللہ ہی ہمارا رب ہے اور اُس کے سوا کوئی نہیں۔ پھر ساتھ ہی اُس پر جم گئے اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنی خدا پرستی کو قائم کیا سو یہ لوگ ہیں کہ کامرانی اور فتح مندی کے لیے خدا نے اُن کو چُن لیا ہے۔ وہ اپنی ملائکہ نصرت کو اُن پر بھیجتا ہے جو ہر دم پیام شادمانی و کامیابی پہنچاتے ہیں کہ نہ تو تمہارے لیے خوف ہے اور نہ کسی طرح کی غمگینی۔ دُنیا کی زندگی میں بھی تم خدا کی نصرت و حمایت سے فتح مند و کامیاب ہو گئے اور آخرت میں بھی خدا کی مہربانیوں سے بامراد۔ اللہ کی تمام نعمتیں صرف تمہارے ہی لیے ہیں۔ تم جو نعمت چاہو گے تمہیں ملے گی اور جس چیز کو پکارو گے پاؤ گے۔

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

کیونکہ وہ جو ربیع الاوّل میں آیا، اُس نے کہا کہ غم اور ناکامی اُن کے لیے ہونی چاہیئے جن کے پاس کامیابی و نصرت بخشنے والے کا رشتہ نہیں ہے، پر وہ جنھوں نے تمام انسانی اور دُنیاوی طاقتوں سے سرکشی کر کے صرف خدا کی قدوس طاقت کے ساتھ وفاداری کی اور اس ذات کو اپنا دوست بنالیا جو ساری خوشیوں کا دینے والا اور تمام کامیابیوں کا سرچشمہ ہے، تو وہ کیونکر غمگینی پا سکتے ہیں۔ اور خدا دوستوں کے ساتھ اس کی زمین کون ہے جو دُشمنی کر سکتا ہے؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاَنَّ الْكٰفِرِيْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ (۴۷:۱۲) اِس لیے کہ اللہ مومنوں کا دوست اور حامی ہے مگر کافروں کا نہیں جنھوں نے اِس سے انکار کیا۔

جن پاک روحوں نے خدا کی سچائی اور کلمۂ حق و عدل کی خدمت گذاری کے

لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا، وہ کسی سے نہیں ڈر سکتے، البتہ اُن کی ہیبت و قہاریت سے دُنیا کو ڈرنا چاہیئے:

فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ — دُشمنانِ حق کی شیطانی ہیبتوں سے نہ ڈرو، اللہ سے ڈرو اگر فی الحقیقت تم مومن ہو۔

دُنیا میں متضاد سے متضاد اجزا باہم جمع ہو سکتے ہیں۔ آگ اور پانی ممکن ہے کہ ایک جگہ جمع ہو جائیں، شیر اور بکری ہو سکتا ہے کہ ایک گھاٹ سے پانی پی لیں، لیکن خدا کا "ایمان" اور "انسان کا خوف" یہ دونوں چیزیں ایسی متضاد ہیں جو کبھی بھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اور اگر ایک بدبخت ایمان الٰہی کا دعویٰ کر کے انسان کے ڈر سے بھی کانپ رہا ہے، تو تم اُسے ان کنکروں اور پتھروں کی طرح ٹھکرا دو جو انسان کی راہ میں لڑھک کر آ جاتے ہیں، تاکہ دوڑنے والوں کے لیے ٹھوکر بنیں، کیونکہ وہ ایمان کے یقین سے محروم ہے:

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ — نہ ہراساں ہو اور نہ غمگین ہو، تمہیں سب پر غالب آنے والے ہو اگر تم سچے مومن ہو!

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ — یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ کے دوست اور اس کے چاہنے والے ہیں، اُن کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے، اور نہ کبھی غمگیں ہوں گے!

استبدال نعمت

لیکن آج جبکہ تم عید میلاد کی مجلسیں منعقد کرتے ہو، تو تمہارا کیا حال ہے؟ وہ تمہاری دولت کہاں ہے جو تمہیں دی گئی تھی؟ وہ تمہاری نعمت کامرانی کدھر گئی

جو تمہیں سونپی گئی تھی؟ وہ تمہاری روح حیات کیوں تمہیں چھوڑ کر چلی گئی، جو تم میں پھونکی گئی تھی؟ آہ! تمہارا خدا تم سے کیوں روٹھ گیا؟ اور تمہارے آقا نے کیوں تم کو صرف اپنی ہی غلامی کے لیے نہ رکھا، کیا ربیع الاوّل کے آنے والے نے خدا کا وعدہ نہیں پہنچایا تھا کہ عزت صرف تمہارے ہی لیے ہے؟ اور اس دولت کا اب زمین پر تمہارے سوا کوئی وارث نہیں؟

اِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ عزت اللہ کے لیے ہے، اُس کے رسول کے لیے، اور مومنوں کے لیے۔ لیکن جن کے دل نفاق سے کھوئے گئے، وہ اِس حقیقت کو نہیں جانتے۔

پھر یہ کیا انقلاب ہے کہ تم ذلت کے لیے چھوڑ دیے گئے ہو، اور عزت نے تم سے منہ چھپا لیا ہے؟ کیا خدا کا وعدہ نصرت تم تک نہیں پہنچایا گیا تھا کہ:

وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ مسلمانوں کو نصرت و فتح دینا ہمارے لیے فروری ہے۔ یہ کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ہم غیروں کو فتح یاب کریں اور مومن ناکام رہ جائیں

پھر یہ کیوں ہے کہ تم نے کامیابی نہ پائی اور کام مراد نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا؟ کیا خدا کا وعدہ سچا نہ تھا اور کیا وُہ اپنے قول کا پکا نہیں؟ تم جو انسانوں کے وعدوں پر ایمان رکھتے اور اُن کے حکموں کے آگے گرنا جانتے ہو، خدا کے وعدہ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ کے لیے اپنے اندر ایمان کی کوئی صدا نہیں پاتے؟ آہ! نہ تو اُس کا وعدہ جھوٹا تھا اور نہ اُس نے اپنا رشتہ توڑا، مگر تم ہی ہو، تمہاری ہی محرومی و بے وفائی ہے۔ یہ تمہارے ہی ایمان کی موت اور راستی کی حرمانی ہے۔ جس نے اپنے پیمانِ وفا کو توڑا، اور خدا کے مقدس رشتے کی عزت کو اپنی غفلت اور بداعمالی اور غیروں کی پرستش و بندگی سے بٹہ لگایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۸:۵۵)

اِس لیے کہ خدا کبھی کسی قوم کی نعمت کو محرومی سے نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود ہی اپنے اندر تبدیلی نہ کر دے اور وہ اپنے بندوں کے لیے ظالم نہیں ہے کہ اُن کو بغیر جرم کے سزا دے۔

خدا اب بھی غیروں کے لیے نہیں بلکہ صرف تمہارے ہی لیے ہے، بشرطیکہ تم بھی غیروں کے لیے نہیں بلکہ صرف خدا ہی کے لیے ہو جاؤ:

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ

اگر تُم خدا کے کلمۂ حق کی مدد کرو گے تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور تمہارے اندر ثابت قدمی اور مضبوطی پیدا کر دے گا۔

یادگارِ حُریّت

تم ربیع الاوّل میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعویٰ رکھتے ہو، اور مجلسیں منعقد کر کے اُس کی مدح وثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو، لیکن تمہیں کبھی بھی یہ یاد نہیں آتا کہ جس کی یاد کا تمہاری زبان دعویٰ کرتی ہے، اُس کی فراموشی کے لیے تمہارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی مدح وثنا میں تمہاری صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں، اس کی عزت کو تمہارا وجود بٹہ لگا رہا ہے؟ وہ دُنیا میں اِس لیے آیا تھا تاکہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کی صراطِ مستقیم پر چلائے، اور غلامی کی اُن تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے اُنھوں نے اپنے پاؤں میں ڈال لیے تھے:

يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ — پیغمبرِ اسلام کے ظہور کا مقصد یہ ہے کہ گرفتاریوں

كَانَتْ عَلَيْهِمْ — اور بندشوں سے انسان کو نجات دلائے، اور غلامی کے جو طوق انھوں نے اپنی گردنوں میں پہن رکھے ہیں، اُن کے بوجھ سے رہائی بخشے۔

اس نے کہا کہ اطاعت صرف ایک ہی کی ہے اور حکم و فرمان صرف ایک ہی کے لیے سزاوار ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ — حکم و طاقت کسی کے لیے نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لیے۔

اس نے سب سے پہلے انسان کو اُس کی چھنی ہوئی آزادی و حریت واپس دلائی اور کہا کہ مومن نہ تو پادشاہوں کی غلامی کے لیے ہے، نہ کاہنوں کی اطاعت کے لیے، نہ کسی اور انسانی طاقت کے آگے جھکنے کے لیے، بلکہ اُس کے سر کے لیے ایک ہی چوکھٹ، اُس کے دل کے لیے ایک ہی عشق، اُس کے پاؤں کے لیے ایک ہی زنجیر، اور اُس کی گردن کے لیے ایک ہی طوق اطاعت ہے، وہ جھکتا ہے تو اُسی کے آگے، روتا ہے تو اُسی کے لیے، اعتماد کرتا ہے تو اُسی کی ذات پر، ڈرتا اور لرزتا ہے تو اُسی کی ہیبت سے، اُمید کرتا ہے تو اسی کی رحمت پر۔ وہ مشرک نہیں ہے کہ خدا کی طرح انسانوں کو بھی ہیبت اور قہاریت کی صفت بخشے؛

ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ

پرستش اور غلامی کے لیے کئی ایک معبود بنا لینا اچھا یا ایک ہی خدائے واحد و قہار کا ہو رہنا؟ یہ جو تم نے اپنی بندگی کے لیے بہت سی ہستیاں بنا رکھی ہیں، تو بتلاؤ، اُن کی ہستی بجز اس کے کیا ہے کہ چند وہم ساز نام ہیں؟ جو تم نے اور تمہارے بڑوں نے اپنی گمراہی سے گڑھ لیے اور مدت کی ضلالت و رسم

پرستی نے اُن کے اندر مصنوعی ہیبت و مرعوبیت پیدا کر دی۔ حالانکہ خدا نے نہ تو اُن کے اندر کوئی طاقت رکھی ہے اور نہ اُن کی معبودیت و محبوبیت کے لیے کوئی حکم اتارا، یقین کرو کہ تمہاری غلامی کے وہ تمام مصنوعی بُت کچھ بھی نہیں ہیں۔ حکم و سُلطانی دُنیا میں نہیں ہے مگر صرف اللہ کے لیے۔ اس نے حکم دیا کہ پرستش نہ کرو مگر صرف اُسی کی۔ یہی انسان کی فطرتِ صالحہ کی راہ ہے اور اس لیے یہی دینِ قیم ہے۔

اور دیکھو کہ اس نے انسان کی حریتِ صادقہ اور آزادیِ حق کو کس طرح مثالوں کی دانائی میں سمجھایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ
عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا
فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ۚ هَلْ
يَسْتَوٗنَ (۱۶: ۷۷)

اللہ ایک مثال دیتا ہے۔ یُوں فرض کرو کہ ایک شخص ہے جو کسی دوسرے انسان کا غلام ہے۔ خود اسے کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ اپنی کسی چیز پر باوجودیکہ اسی کی ہے، کچھ قدرت نہیں رکھتا اور صرف اپنے آقا کے حکموں کا بندہ ہے، مگر اس کے مقابلے میں ایک دوسرا آزاد اور خود مختار انسان ہے جس پر کسی انسان کی حکومت نہیں، اُسے اپنی ہر چیز پر قدرت و اختیار حاصل ہے اور جو کچھ خدا نے دیا ہے وہ اُسے ظاہر و پوشیدہ، جس طرح چاہتا ہے بے دھڑک خرچ کرتا ہے، تو کیا دونوں آدمی ایک ہی طرح کے ہوئے؟ کیا دونوں کی حالت میں کوئی فرق نہیں؟ اگر فرق ہے تو پھر وہ کہ اس کا مالک صرف خدا ہی ہے، اور وہ کہ اس کے گلے میں انسانوں کی اطاعت کے طوق پڑے ہوئے ہیں، دونوں ایک طرح کے کیسے ہو سکتے ہیں؟

پس اگر ربیع الاوّل کا مہینہ دُنیا کے لیے خوشی و مسرّت کا مہینہ تھا، تو صرف

اِس لیے کہ اِسی مہینے میں دُنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا جس نے مسلمانوں کو اُن کی سب سے بڑی نعمت یعنی خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی عطا فرمائی، اور اُس کو اللہ کی خلافت و نیابت کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک و محترم امانت ٹھہرایا، پس ربیع الاوّل انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے۔ غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے، خلافت الٰہی کی بخشش کا اوّلین یوم ہے۔ وراثتِ ارضی کی تقسیم کا اوّلین اعلان ہے۔ اِسی ماہ میں کلمۂ حق و عدل زندہ ہوا، اور اسی میں کلمۂ ظلم و فساد اور کفر و ضلالت کی لعنت سے خدا کی زمین کو نجات ملی۔

لیکن آہ، تم کہ اِس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو، اور اس کے لیے ایسی تیاریاں کرتے ہو، گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری ہی خوشیوں کے لیے آیا ہے۔ ’’للہ مجھے بتاؤ کہ تم کو اُس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور رُوح کا اپنے کو ساتھی بنائے؟ کیا ایک مُردہ لاش پر دُنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی۔ اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد رکھے گی؟ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دُنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے، لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے؟

پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی، ماسوائے اللہ رشتوں کی غلامی، اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا دیا ہے۔ تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو، جو نہ تو خود کر سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور رُوح ہے، البتہ چُور چُور ہو سکتا اور ایک دوسر

پر ٹپکا جاسکتا ہے۔ تم غبارِ راہ کی ایک مُشت ہو جس کو ہوا اُڑا لے جائے تو اُڑ سکتی ہے، ورنہ وہ خود صرف اس لیے ہے تا کہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولانِ قدم سے پامال کی جائے

گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگِ حنا تو
اے خونِ شُدہ دِل، تو تو کسی کام نہ آیا

پھر اے غفلت کی ہستیو، اور اے بے خبری کی سرگشتہ خواب روحو! تم کس مُنہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریتِ انسانی کی بخشش، حیاتِ روحی و معنوی کے عطیہ، اور کامرانی و فیروزمندی کی خسروی و ملوکی کے لیے آیا تھا؟ اللہ اللہ غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی، ماسوائے اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں، انسانوں کی ملوکیت و مرغوبیت کے طوقے گردنوں میں، ایمان باللہ کے ثبات سے دل خالی، اور اعمالِ حقّہ و حسنہ کی روشنی سے رُوح محروم! ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مُستعد ہوئے ہو کہ ربیع الاوّل میں آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح، غیر الٰہی عبودیت کی ہلاکت، حریتِ صادقہ کا اعلانِ حق، عدالتِ حقّہ کی ملوکیت کی بشارت اور اُمّتِ عادلہ و قائمہ کے تمکن و قیام کی بُنیاد تھا!

پس اے غفلت شعارانِ ملّت! تمہاری غفلت پر صد فغان و حسرت، اور تمہاری سرشاریوں پر صد ہزار نالہ و بکا، اگر تم اس ماہ مبارک کی اصلی عظمت و حقیقت سے بے خبر رہو اور صرف زبانوں کے ترانوں، در و دیوار کی آرائشوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اس کے مقصد یادگاری کو گم کر دو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ

ماہ مبارک امّت مسلمہ کی دُنیا کا پہلا دن ہے، خداوندی پادشاہت کے قیام کا اوّلین اعلان ہے، خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا سب سے پہلا مہینہ ہے۔ پس اس کے آنے کی خوشی اور اس کے تذکرہ و یاد کی لذّت ہر اس شخص کی رُوح پر حرام ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے اس پیغام الٰہی کی تعمیل اطاعت اور اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔ فَبَشِّرْ عِبَادِیَ الَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

عراق و لیلائے عراق!

ایک لمحۂ اشک سرزمین ''مجوی من عمّاہ مہری'' یاد میں!

یقولون "لیلیٰ" بالعراق مریضۃ

فما لک لا تفنی وانت صدیق!

شفی اللہ "مرضیٰ" بالعراق، فاننی

علی کل مرضیٰ بالعراق شفیق

فان تک "لیلیٰ" بالعراق مریضۃ

فانی فی بحر الحتوف غریق!

اھیم باقطار البلاد وعرضھا

وما لی الیٰ "لیلیٰ" الغداۃ طریق

یہ اشعار امویہ کے مشہور عاشق قیس عامری کی طرف منسوب ہیں کہتے ہیں کہ ایک دن قیس اپنی شوریدگی میں بے خبر پڑا تھا کہ اس کے کانوں میں کسی کی آواز آئی جو کہہ رہا ہے۔

الا ان لیلی بالعراق مریضۃ
و انت خلی البال تلھو و ترقد

"لیلیٰ عراق میں بیمار پڑی ہے اور تیرا حال یہ ہے کہ بے فکر و بے خبر کھیل کود میں اپنا وقت کاٹ رہا ہے"!

فلو کنت یا مجنون تفنی من الھوی
لبت کما بات السلیم المسھد

"اے مجنوں اگر تُو واقعی بیماری محبت کا مریض ہے، اور تجھے لیلیٰ کے عشق و شیفتگی کا دعویٰ ہے، تو ضرور تھا کہ تیرے محبوب کے دُکھ میں پڑنے کے ساتھ ہی تجھ پر بھی دُکھ طاری ہو جاتا، اور اُس کی بیقراری سے زیادہ تجھ میں بیقراری اور بے چینی ہوتی۔ عشق کا دعویٰ اور بے دردوں کی طرح بے فکری یہ دونوں چیزیں جمع نہیں ہو سکتیں"!

کہتے ہیں کہ یہ سنتے ہی قیس مجنوں پر ایک بجلی سی گر گئی، جوشِ تاسف میں اُس نے گریبان پھاڑ ڈالا، سر اور چہرے پر خاک ملنے لگا۔ عراق و لیلا نے عراق کے سوا اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلتا تھا، وہ بے خود اُٹھا اور ایک سچے دیوانۂ عشق کی شان سے کوہ و بیابان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ابو عیسٰی روایت کرتا ہے کہ اس وقت مندرجہ بالا اشعار اُس کی زبان پر تھے جن کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

اگر واقعی یہ سچ ہے کہ لیلیٰ عراق میں بیمار ہے تو مجھے بیماری کی دعوت نہ دو، مَیں تو مَوتوں اور ہلاکتوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہوں!

مَیں شہروں میں گشت لگاتا ہوں اور عراق تک پہنچنے کی راہ ڈھونڈتا ہوں، لیکن افسوس کہ لیلیٰ تک پہنچنے کی تمام راہیں بند ہو گئی ہیں!

"خدا سرزمینِ عراق کے تمام بیماروں کو شفا دے، کیونکہ جب سے میں نے اپنے بیمار عراق کی خبر سُنی ہے، عراق کے ہر بیمار کے لیے شفیق ہو گیا ہوں!"

لیکن اے سرزمینِ عراق! اے بہشت زار دجلہ و فرات! اے مصداق تجری من تحتہا الانہار! اے مایۂ عشق چہل کرور نفسِ ملت! قیس عامری کی لیلیٰ چند دنوں کے لیے تیری آبادیوں میں آ بسی تھی، اور اس لیے وہ تجھ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا، لیکن آہ ہمارے لیے تو تیری تمام سرزمین یکسر لیلیٰ زار حسن و جمال ہے اور تیری کسی ایک عمارت کے اندر ہی نہیں، بلکہ تیری خاک کے ہر ذرے کے اندر ہمارے عشق ماضی کا ایک جلوۂ حسن و جمال آراستہ ہے! قیس عامری کی لیلیٰ اگر بادیۂ نجد کے خیموں سے نکل کر تیری سرزمین میں آ گئی تھی، تو ہمارے اقبال رفتہ کی بھی ایک لیلیٰ جو ریگ زار حجاز سے نکلی، اور صدیوں تک تیری سرزمین اس کے لیے منزل عیش و دلستان رہی۔ بابل و نینوا کی وراثت تیری ہی سرزمین میں ہم کو دی گئی تھی کلدان اور مدائن کے محفوظ خزانے تو نے ہی ہمارے سپرد کیے تھے ہارون الرشید کی سُنہری کشتیاں تیرے ہی دجلہ میں تیرتی تھیں، مامون اعظم کا دربار عظمت و اجلال تیرے ہی خاک کا ایک افسانۂ گذشتہ ہے تو یہی ہے کہ تیری زمین کا ایک ایک کھنڈر تیری خاک کا ایک ایک تودہ، تیری نہروں کی ایک ایک لہر کاروانِ رفتۂ لیلیٰ کا نقش قدم اور کاروبارِ عشق و ماضی کا افسانہ سرا ہے اور پھر اے سرزمینِ لیلیٰ! تیری ہی فضا محبوب ہے جس کے ہر ذرے سے آج بھی بازگشت ناقۂ لیلیٰ کی صدائیں اُٹھ رہی ہیں، اور ہر اس مجنون کے لیے ملامت ہے جو عشق لیلیٰ کے دعویٰ کے ساتھ

سرزمین لیلیٰ سے تغافل بھی کر رہا ہے، حالانکہ عشق لیلیٰ کا دعویٰ اور مسکن لیلیٰ سے غفلت، یہ دونوں چیزیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں :-

فلو كنت بالمجنون تقسني من الهوىٰ

لبت كما بات السليم المسهد

پس افسوس ہے اس دل پر، جس نے "لیلیٰ" کی یاد کو ایک لمحہ کے لیے بھی بھلا دیا اور صد افسوس ہے اُس آنسو پر جو لیلیٰ کے سوا کسی دوسرے پر بہایا گیا :

اذا كان هذا الدمع يجري صبابة

على غير ليلى، فهو دمع مضيم

مندرجہ بالا سطور بے اختیار قلم سے نکل گئیں، جبکہ موجودہ واقعات کی تقریب سے ہم نے ارادہ کیا کہ سرزمین عراق و بغداد کے بعض مناظر البلاغ کے صفحات پر شائع کریں۔ عالمگیر جنگ یورپ کے معرکے کچھ عرصے سے سرزمین ایشیا میں منتقل ہو گئے ہیں، از انجملہ سرزمینِ بغداد ہے، جہاں مہینوں سے میدان اقدام دار و گیر گرم ہے، اور خصوصیت کے ساتھ قطۃ العمارہ اور مابین بصرہ و بغداد کے مقامات دُنیا کے سامنے آ رہے ہیں، چُنانچہ اس موقعہ میں بھی سب سے پہلے العمارہ کی آبادی کا ایک منظر آپ کے سامنے ہے جو دجلہ کے کنارے واقع ہے، اور اگر آپ چشم تصور سے کام لیں تو انہی ساحلی عمارتوں کے عقب میں جنگ عراق گذشتہ کے بہت سے عبرت انگیز نتائج و حوادث نظر آ سکتے ہیں - وھموا بما لم ینالوا۔

لے افسوس ہے کہ تصویریں کتاب میں شامل نہیں کی جا رہی ہیں - مرتب

یہ مناظر دجلہ کے سلسلے میں پہلا منظر تھا۔ نہر دجلہ کا دوسرا منظر بغداد جدید کی وسط آبادی کا ہے جہاں مغربی و شرقی آبادی کو ایک نئے پُل کے ذریعے ملا دیا گیا ہے، اور پُل کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی کشتیاں بکثرت نظر آرہی ہیں۔ یہ کشتیاں اب تو زیادہ تر شہر کی اندرونی آمد و رفت کے لیے کام میں لائی جاتی ہیں، لیکن کسی زمانے میں ہارون الرشید اور مامون اعظم کی سیر و تفریح کا بڑا ذریعہ یہی تھیں

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ

تیسرا موقع سفارت خانہ برطانیہ کی جدید عمارت اور دجلہ کی قدیم روانی، دونوں کا مشترک منظر ہے۔ دجلہ کی سطح اگرچہ بالکل خاموش اور ساکن ہے، حتیٰ کہ ایک ہلکی سی لہر بھی اس پر حرکت کرتی ہوئی نظر نہیں آتی، تاہم اگر آپ سُننا چاہیں تو اُس کی زبان چُپ نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ صدائیں صرف لبوں کی حرکت ہی سے نہیں نکلتیں۔ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خاموش چہرہ اور ایک غیر متحرک لب ان غوامض و اسرار کی شرح و تفصیل کر دیتا ہے جن کے لیے زبان کی حرکت اور حلق کی آواز بالکل گونگی ہوتی ہے۔ خاموش فصاحت نے اکثر گویائی کے دعووں کو شکست دی ہے:

لسان عیبی فی الھویٰ وھو ناطق

ودمعی فصیح فی الھویٰ وھو اعجم

نظارۂ دجلہ کی ان تین منزلوں کے بعد اب ذرا اُن لوگوں کے حالات پر بھی نظر ڈال لیجیے جن کی یاد دجلہ کی یاد اور سرزمینِ دجلہ سے وابستہ ہے۔ ایک عجیب مخروطی شکل کا گنبد آپ دیکھ رہے ہیں جو کسی ہشت پہلو عمارت کے اُوپر سے نمایاں ہے،

اور عمارت کے ہر طرف پختہ قبریں بنی ہوئی ہیں۔ یہ مشہور زبیدہ خاتون زوجہ ہارون الرشید کا مقبرہ ہے، اور دجلہ کے بعد ہی آپ کے سامنے آگیا ہے، تاکہ مکان کے ساتھ اس کے پچھلے مکینوں کو بھی دو گھڑی یاد کر لیں۔

بغداد اور بغداد والوں کو یہیں چھوڑ دیجئے، اور آگے بڑھئے۔ اب آپ گنبدوں اور میناروں کی ایک موثر سرزمین کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی یاد و تذکرہ کی تقدیس کو زمانہ کے صدہا تغیرات و حوادث بھی نقصان نہ پہنچا سکے، اور سرزمین عراق کا سب سے زیادہ پُر اثر اور تاریخی حصّہ ہے یہ کربلا کی سرزمین عبرت و بصیرت ہے اور روضۂ حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السّلام کا درخشاں گنبد اور اُس کے سر بفلک منارے آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ منارے حق کی طاقت کا اعلان ہیں، اور کلمۂ حریت کی فتح اور کلمۂ استبدا کے خسران و خذلان کی شہادت ہیں۔ وہ بتلا رہے ہیں کہ دُنیا میں سب سے بڑی طاقت حق کی ہے نہ کہ انسانی تاج و تخت کی، اور خدا کی زمین پر سب سے بڑا فتح مند وہی ہے۔ جس نے سب سے زیادہ مظلومی کے ساتھ اپنا خون بہا یا۔ تیرہ سَو برس ہوئے کہ اس سرزمین پر دو گروہ باہم معرکہ آرا ہوئے تھے ایک گروہ صرف بہتّر بھوکے پیاسے انسانوں کا ضعیف و ناتوان مجمع تھا اور جانوں کے سوا اُس کے پاس کچھ نہ تھا دوسری طرف دمشق کا تاج و تخت، حکومت و سلطنت، ساز و سامان، خسروی و ملوکی، اور ہزاروں انسانوں کا قاہر و جابر گروہ تھا۔ بظاہر پہلی جماعت نے شکست پائی، کیونکہ قتل کی گئی اور اُس کے خون سے ساحلِ فرات کی سرزمین مدتوں تک سُرخ رہی لیکن فی الحقیقت یہ ایک محض عارضی منظر تھا۔ غور کیجئے کہ آخر کی فتح مندی اور عاقبت کار کی کامیابی کس کو ملی؟ ان کو جن کے نام و نشان سے بھی آج تمام سطح ارضی خالی ہے، یا اس کو

جس کا گنبد آج تک اپنے بقاء ذکر اور کلمۂ باقیہ کے ثبوت میں سر بفلک استادہ ہے؟
یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آج تمام شاہان بنو امیہ میں سے کسی ایک شخص کی قبر کا بھی دُنیا
سُراغ نہیں لگا سکتی، کیونکہ بنو عباس نے اُن کی قبروں کو اکھاڑ اکھاڑ کے مسمار کر دیا۔ اور
کوئی اثر دُنیا میں باقی نہ رکھا برخلاف اس کے مدفن کربلا کا اثر مجسم اب تک جی د
قائم موجود ہے، اور اگرچہ مخالفین کے دست تظلم نے بارہا اس کو بھی مسمار و بے نام و
نشان کرنا چاہا، تاہم اس کا نشان کسی طرح نہ مٹ سکا، مظلم کا دھبہ کبھی نہیں دھل
سکتا۔ پھر کیا بقائے قبور و آثار کے بارے میں بھی قانون بقائے اصلح کی پابند ہے،
اور اپنی گود میں صرف اسی کے اثر کو باقی رکھنا چاہتی ہے جو اصلح تھا؟

اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں سے بہشت و نعائم بہشت کا وعدہ کیا تھا، اور باغوں
کی سرسبز و شاداب زندگی کی بشارت دی تھی۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جو لوگ ایمان لائے اور اعمال صالح اختیار کیے
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ (بقرہ) تو اُن کو زندگی کی بشارت دے دو۔

یہ باغ وہ تھے جن کا سب سے زیادہ نمایاں وصف یہ تھا:

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (بقرہ) ان کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

یہی جنت تھی جس کا ایمان والوں سے وعدہ کیا گیا تھا، اور جس کا وعدہ گذشتہ
صالح قوموں سے بھی کیا گیا تھا۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا ہمارے بندوں میں جو متقی ہوگا ہم ایسی ہی
مَنْ كَانَ تَقِيًّا۔ جنت کا اُسے وارث بنائیں گے۔

ارباب ایمان و عمل صالح کے لیے یہ وعدہ آخرت میں پورا ہونے والا ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ دُنیا میں پُورا ہو گیا، اور جو لوگ خدا کے متقی بندے تھے انھوں نے اپنی آنکھوں سے بہشتی زندگی کی نعمتوں کو دیکھ لیا۔ کرۂ ارضی کی تمام بہشتی سرزمینوں کے وہی وارث ہوئے، اور فتح مندی و کامرانی کی سُلطانی و کامرانی صرف انہی کے لیے نامزد کی گئی۔ اِس بہشتی زندگی میں نہ تو اُن کے لیے غم تھا اور نہ ہی نامرادی و نا مایوسی کو وہاں بار تھا اور نہ نا اُمیدی کا وہاں نام و نشان۔ وہ جو چاہتے تھے پاتے تھے اور جس نعمت کے لیے اُٹھتے تھے وہ خود اُن کے سامنے جھکنے کے لیے دوڑتی تھی:

جَنّٰتِ عَدْنِ ࣙالَّتِیْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَیْبِؕ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِیًّا ۝ لَا یَسْمَعُوْنَ فِیْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًاؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِیْهَا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا ۝

دائمی عیش و مراد کے باغ جن کا وعدہ خدائے رحمٰن نے اپنے نیک بندوں سے کیا۔ اور جو اگرچہ اُن کے سامنے نہیں ہیں اور نہ ابھی وہ دیکھ سکتے ہیں، مگر اللہ کا وعدہ یقیناً پورا ہو کر رہے گا۔ اِس بہشتی زندگی میں سلامتی و کامرانی کے سوا کوئی بے کار و فضول صدا اُن کے کانوں میں نہیں پڑے گی۔ اُن کا رزق صُبح و شام اُن کے لیے تیار رہے گا اپنی احتیاج اور رزق کے لیے وہ کبھی دُکھ نہ اُٹھائیں گے!

اِس بہشتی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ تجری من تحتها الانهٰر پس آخرت کی جنّت اعلیٰ کا پرتو دُنیا کی حیات بہشتی میں بھی نظر آ گیا، اور وہ تمام بہشتی سرزمینیں مسلمانوں کو سپرد کر دی گئیں، جن کے تلے پاک و شفاف پانی کی نہریں بہہ رہی ہیں۔ آہ، سرزمینِ عراق ہی وہ دُنیا کی جنّت تھی جو عاقبت کی جنّت کا ظلِ کامل ہے، اور جس کے نیچے دجلہ و فرات کی نہریں ہر جگہ اور ہر حصّے میں بہہ رہی ہیں! یہی جنّت دُنیا کے سب سے بڑے تمدنوں اور بڑی سے بڑی

قوموں کی وراثت میں آئی۔ بابل و نینوا کے تمدّن نے یہیں نشو و نما پایا اور ایرانیوں کا تخت جلال و عظمت صدیوں تک یہیں حکمرانی کرتا رہا۔ بالآخر وراثت ارضی کی جب آخری بخشش ہوئی تو دُنیا کے تمام خزائن و دفائن کے ساتھ تجری من تحتہا الانہار کی بہشت ارضی بھی مسلمانوں ہی کو سپرد کی گئی۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا

دُنیا نے انقلابات و تغیرات کے سینکڑوں رنگ بدلے۔ مسلمانوں نے اپنے اعمال صالحہ سے اگر اس بہشت ارضی کا اپنے آپ کو مستحق ثابت کر دیا تھا، تو بداعمالیوں سے اپنی نااہلی کا خود ہی فیصلہ بھی کر دیا۔ ان کے باہمی اختلاف و شقاق کی تلواریں سب سے زیادہ اسی مدینۃ الاسلام میں چمکیں، اور مسلمانوں کے ایک گروہ نے ہمیشہ اس بہشت سے دوسرے کو بے دخل کرنا چاہا۔ خدا کی زمین صرف صلحاء کے لیے ہے۔

اِنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا مِنْ عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اور اس بنا پر کچھ عجب نہ تھا اگر اس بہشت ارضی کے بسنے والوں کو حکم الٰہی ملتا جیسا کہ اور بہت سی سرزمینوں میں ملا:

اِهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ اس جنت سے نکل جاؤ تم میں سے ایک دوسرے کا دشمن ہے۔

لیکن اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور وہ صرف پورا ہی ہونے کے لیے ہے اُس نے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کی بہشت کی جہاں کہیں بشارت دی ہے وہاں ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا ہے: تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا یعنی اس سرزمین بہشت کے تلے نہریں بہہ رہی ہوں گی اور اس میں مسلمان

ہمیشہ رہیں گے کبھی اس سے نکالے نہ جائیں گے۔ اُس کے وعدہ کی سچائی کو دیکھو کہ دُنیا میں صدہا انقلابات و تغیّرات ہو چکے ہیں، لیکن خَالِدِیْنَ فِیْھَا کے وعدہ کا فرمان حق اب تک بدستور نافذ و قائم ہے۔ اور تیرہ صدیوں کی عظیم الشان مدت کے اندر ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا ہے کہ اُس وعدہ کی سچائی میں فرق آیا ہو۔ اس وعدہ الٰہی کے ماضی کو تمام دُنیا دیکھ چکی ہے مگر مستقبل کو دیکھنا ابھی باقی ہے۔ وَکَانَ وَعْدُ اللّٰہِ مَفْعُوْلًا۔

شیعہ کالج

مجوزہ شیعہ کالج

(۱)

باوجود کئی ہفتوں کے اعراض و اغماض کے، آج میں مجبور ہوا ہوں کہ وقت کے ایک ایسے مسئلے کی نسبت چند کلمات لکھوں جو ہمیشہ سے اسلامی مباحث و نظر کا سب سے زیادہ مشتبہ و ظنون آلود موضوع رہا ہے، اور جو اس قدر نامبارک موضوع ہے جس کو کسی طرح بھی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی آلودگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم سچائی کی فاتحانہ حقیقت پر میرا اعتماد ہے، اور اعلان حق اور امر بالمعروف کا شرعی خوف ظنون و ہجوم شبہات سے ساقط نہیں ہو جا سکتا۔ اگر دنیا میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ اُن کی آنکھوں کا ضعف ہے جس کو دور کرنا چاہیے۔ اُن کی خاطر چراغ گل نہیں کیے جا سکتے:

فَذَكِّرْ اِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ

میں آج مجوزہ شیعہ کالج کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ کو یقین ہے کہ میری اس تحریر کو پڑھ کر بہت سے لوگ ظنونِ فاسدہ میں مبتلا ہوں گے، اور کوشش کی جائے گی کہ اس کو فریقانہ جذبات و عصبیت کی

طرف منسوب کیا جائے ۔ لیکن اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ مجھ کو اپنے ان صدہا برادران شیعہ کے جذبات و آراء صادقہ بھی معلوم ہیں جو میرے مسلک و اصول کے متعلق پوری بصیرت رکھتے ہیں، اور اُمید واثق ہے کہ اُن کی اصلی حقیقت شناسی وقت کے صناعی و خارجی جذبات سے کبھی بھی مغلوب نہ ہو سکے گی:

فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ (۱۸:۱۳)

البتہ جن لوگوں کے دماغوں میں کجی اور راستی سے انحراف ہے، تو وہ کلام حق کی صاف صاف اور کھُلی کھُلی باتوں پر غور و تفکر نہیں کریں گے۔ بلکہ صرف اُنہی چیزوں کے پیچھے لگے رہیں گے جن میں اُن کو تشابہ اور ابہام نظر آئے گا تاکہ فتنہ و فساد پیدا کریں اور لوگوں کو راہِ حق سے بھٹکائیں۔

مسئلۂ اصلاح و تجدید اُمّت

سب سے پہلے میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ مسئلۂ "اصلاح و تجدید اُمت" کے متعلق میرا ایک خاص مسلک ہے، اور اس مسلک کی بُنیاد محض بعض جُزئیات عروج و تنزل کے مشاہدہ و تاثر پر نہیں ہے جیسا کہ گذشتہ پچاس سال کی تمام اصلاحی تحریکوں کا حال رہا ہے بلکہ اس کی بُنیاد وہ کلیات و اصول عقائد ہیں جن کو اسلام کی تصریحات، کتاب و سُنّت کی حکمت، عقل و براہین کی دلالت، تاریخ و استقرار تاریخی کے نظر و اخذ، اور تمام جُزئیات ترقی و تنزلِ امم کے درس و فکر کے بعد میں نے قرار دیا ہے اور اس بارے میں ایک پُورا مرتب سلسلۂ عمل اپنے پیشِ نظر رکھتا ہوں:

منجملہ ان عقائد و اصول کے جن پر میرا مسلک دعوت مبنی ہے ایک سب سے بڑا اہم اصول وہ ہے جس کو میں مسئلۂ تحزب و تمذہب سے تعبیر کرتا ہوں یعنی مُسلمانوں کا

توحید و تالیف کے بعد پھر متفرق ہو کر گروہ در گروہ ہو جانا اور ایک اُمتِ قیمہ کی جگہ مختلف ناموں اور مختلف مذہبوں میں بٹ جانا۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام ادبار و تنزل کی اصلی و حقیقی علت یہی چیز ہے، اور جب تک یہ دُور نہ ہوگی اُس وقت تک کوئی سعی و احیاء کامیاب نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کا سیاسی تنزل، اخلاقی تنزل، علمی تنزل، مدنی و عمرانی تنزل، یہ تمام جزئیات تنزل ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی کلی اصل نہیں ہے۔ اِن تمام مختلف شاخوں سے گذر کر جب درخت کی جڑ تک نظر پہنچے گی تو صاف نظر آ جائے گا کہ علل و اسباب کے کلیات دوسرے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ اہم و نافذ علت مسلمانوں کی تالیف کے بعد تفریق، توحید کے بعد تعدد، اجتماع کے بعد افتراق، اور نزول علم کے بعد بغی و عدوان ہے۔

بظاہر اس چیز کو ہر شخص محسوس کرتا ہے، اور مسلمانوں کے تنزل کے اسباب پر ماتم کرتے ہوئے کوئی آنکھ ایسی نہیں ہے جس کے آنسوؤں میں اس منظر کو دخل نہ ہو، تقریباً سب کہتے ہیں کہ اختلاف سے اتفاق بہتر ہے اور دشمنی کو محبت پر ترجیح دینی چاہیے۔ بایں ہمہ بدبختی یہ ہے کہ مسئلہ اختلاف و افتراق اُمت کو اس کی اصل اہمیت کوئی بھی نہیں دیتا، اور کسی کو اس کی توفیق نہیں ملتی کہ ظواہر و آثار سے گذر کر اسبابِ علل پر نظر ڈالے، اور صحتِ نظر کے ساتھ اصلیت مستورہ کی تشخیص کرے۔ اگر گذشتہ دورِ اصلاح و تحریک میں کسی کا قدم یہاں تک پہنچا بھی ہے تو بدبختانہ اس کے بعد کی منزل علاج گم ہو گئی ہے، اور یہ افسانہ بہت طول طویل ہے۔

درخت جب سوکھتا ہے تو اس لیے نہیں سوکھتا کہ اس کی شاخوں میں [illegible] کہ رطوبت حیات کا سرچشمہ جڑ ہے اور اب اس

میں زندگی باقی نہیں رہی۔ اِسی طرح کوئی قوم اس لیے نہیں بگڑتی کہ اُس نے اپنی تعلیم سعادت کی فروعات کو چھوڑ دیا بلکہ اس لیے کہ اصول و کلیات کا سرِشتہ اس کے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ جب تک جڑ میں زندگی ہے۔ اُس وقت تک درخت کا ایک پتہ بھی خشک نہیں ہو سکتا لیکن اگر جڑ کو پانی نصیب نہیں تو شاخوں اور پتوں کے اُوپر سمندر کے سمندر بھی اونڈیل دو، وہ سرسبز نہیں ہو سکتے۔

اِسلام کے بھی اصول ہیں اور فروع ہیں۔ پس مسلمانوں کی تباہی و بربادی کو اصول میں ڈھونڈھنا چاہیئے نہ کہ فروع میں۔ اِسلام کی اوّلین اصل عقیدۂ توحید ہے۔ اِسی عقیدے کے اندر مسلمانوں کی تمام رُوحِ حیات مضمر تھی اور اسی رُوح نے اُن کو دائمی زندگی کی خوشخبری سُنائی تھی۔ لیکن مسلمانوں نے سب سے زیادہ اسی عقیدے سے انحراف کیا۔ حتٰی کہ آج اس سے بڑھ کر اور کسی اعتقاد میں وہ تجدید دعوت کے محتاج نہیں ہیں۔ جس طرح عقیدۂ توحید کے معنی یہ نہ تھے کہ مشرکین مکہ کی طرح زبان سے تو ایک صانعِ کل کا اقرار کر دیا جائے (لَیَقُولُنَّ اللّٰہ) لیکن اپنی عملی زندگی پر مساعی غیر الٰہی عبودیتوں کی لعنت بھی طاری کر لی جائے۔ اسی طرح توحید کی حقیقت کے ساتھ یہ ضلالت بھی جمع نہیں ہو سکتی تھی کہ ایک فاطر السمٰوات والارض کی بندگی کا دعویٰ کر کے بہت سے خداؤں کے ماننے والوں کی طرح بہت سی جماعتوں اور شکلوں میں متفرق ہو جائیں۔ اعتقادِ توحید کا اوّلین مطالبہ یہ تھا کہ تمام کرۂ ارضی کی سعادت و ہدایت کے لیے ایک ایسی اُمّتِ عادلہ تیار ہو، جو تمام پچھلی قوموں کے برخلاف اپنے تمام عقائد و اعمال کے اندر جلوۂ توحید رکھے اس کا خدا ایک ہو، اس کا مبدءِ حکمِ سُلطانی ایک ہو، اس کا مصدرِ امورِ نہی ایک ہو، اُس کا

قبلہ ایک ہو، اُس کا نام ایک ہو، اُس کے خصائص و اعمال ایک ہوں یعنی جس طرح اس کا خدا وحدہٗ لاشریک ہو، اسی طرح اس کا قرآن بھی اپنی ہدایت میں، اس کا رسول بھی اپنی تعلیم کتاب و حکمت میں، اور اس کی اُمت بھی اپنے خصائص و محامد اور وحدت و یگانگت میں وحدہٗ لاشریک ہو۔ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسلام کی حقیقت اصلی اس چیز کو بتلایا ہے جو اختلاف و تفریق کے ساتھ جمع ہی نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر جگہ اسلام کو "وحدت و تالف" اور کفر کو "تعدد و تشتت" قرار دیتا ہے اور جس شدت اور اعادۂ و تکرار کے ساتھ شرک سے روکتا ہے، ٹھیک ٹھیک اسی طرح تفرق و شقاق سے بھی باز رکھنا چاہتا ہے۔ وہ بار بار کہتا ہے کہ تم "مغضوب علیہم" یعنی یہود و "الضالین" یعنی نصاریٰ کی ضلالتوں سے اپنے آپ کو بچاؤ اور "انعام یافتہ" جماعتوں کی راہ پر چلو۔ پھر جا بجا تشریح کرتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کی سب سے بڑی ضلالت یہ تھی کہ انھوں نے نزول شریعت کے بعد وہ ایک نہ رہے اور مختلف مذہبوں، مختلف جماعتوں، مختلف ناموں، مختلف غیر الٰہی عبودیتوں میں متفرق ہو گئے۔

اَلَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا وَّكُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰:۳۲)	اُن لوگوں کی راہ اختیار نہ کرو جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور ایک اُمت ہونے کی جگہ گروہ گروہ ہو گئے۔ ہر فرقہ اپنے ہی خیالات و اعمال کو حق سمجھتا ہے اور اس پر قانع اور خوش حال ہے!

اس سے بھی زیادہ یہ کہ جا بجا واضح کیا کہ کسی اُمت کے لیے تالیف و اتحاد

رحمت الٰہی ہے، اور تحزب و تفریق عذاب الٰہی۔ خدا جب کسی قوم کو سزا دینا چاہتا ہے تو اس میں باہمی تفرقہ اور اختلاف ڈال دیتا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ (۶: ۶۵)

کہہ دے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب لائے یا تمہارے قدموں کے نیچے ہی سے اس کا عذاب نمایاں ہو، یا پھر تمہارے اندر پھوٹ ڈال دے، تم گروہ گروہ اور جماعت جماعت ہو جاؤ، اور باہم ایک دوسرے سے لڑ کر خود اپنی ہی تلوار سے اپنے کو ہلاک کرو۔

اللہ کے رسول نے سب سے بڑی وصیت امت کو یہی کی:

لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم اعناق بعض (بخاری)

میں نے تم کو مذہب شقاق و افتراق سے نکال کر اتحاد و تالیف کی رحمت کا پیکر بنا دیا ہے لیکن میرے بعد کافروں کا طریق اختیار نہ کرنا کہ باہم ایک کی تلوار دوسرے کی گردن پر چلے۔

اور یہی تیر ہے جس کی طرف باب مدینۃ العلم حضرت امیر علیہ السلام نے اپنے ایک خطبہ مقدسہ میں دعوت دی:

الٰھھم واحد و نبیھم واحد وکتابھم واحد افامرھم اللہ بالاختلاف فاطاعوہ ام نھاھم عنہ فعصوہ؟ ام انزل اللہ دینا ناقصا فاستعان بھم علی اتمامہ (نہج البلاغۃ، مصری ص۶۲)

ان کا خدا ایک ہے، نبی ایک ہے، پھر کیا ہے کہ وہ باہم اختلاف کرتے ہیں؟ خدا نے کیا ان کو اختلاف کا حکم دیا ہے کہ اس کی پیروی میں مختلف ہو رہے ہیں؟ یا اس نے اختلاف سے روکا ہے اور وہ حکم الٰہی کی نافرمانی کر رہے ہیں؟ یا پھر یہ کہ خدا نے ناقص دین اتارا اور اس لیے اس طریق سے اب اسے مکمل کرنا چاہتے ہیں؟

قرآن حکیم کی بے شمار تصریحات کو میں ایک تمیسنٔ ٹکڑے میں کہاں تک نقل کروں ؟ مختصر یہ کہ سب کو یاد ہے اور سب پڑھتے ہیں : وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ اِنْ کُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِکُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا آگے چل کر فرمایا : وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَ هُمُ الْبَیِّنٰتُ ، اُن قوموں کی طرح نہ ہو جاؤ جو تم سے پہلے گذر چکی ہیں ، اور جن کا حال یہ رہا ہے کہ خدا کی شریعت کے نزول کے بعد پھر متفرق ہو گئیں اور اتحاد کی جگہ اختلاف کی راہ اختیار کی ۔

لیکن بد بختانہ مسلمانوں نے وہی کیا جس سے وہ روکے گئے تھے خدا نے اُن کو دوسروں کے لیے تلوار دی تھی ، انھوں نے خود اپنوں پر چلائی ۔ خدا نے اُن کو ایک بنایا تھا ، وہ متعدد جماعتوں میں منفرق ہو گئے ۔ خدا نے اُن کو ایک شریعت دی تھی ، اُنھوں نے بہت سی شریعتیں بنا لیں ۔ خدا نے ان کا ایک ہی نام "مسلم" رکھا تھا : هُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا (۲۲ : ۷۸) اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ یعنی دینِ الٰہی صرف اسلام ہے ۔ اور اللہ نے تمہارا نام ہمیشہ سے اور ہمیشہ کے لیے صرف مُسلم رکھا ہے ، مگر اُن میں سے ہر جماعت نے اپنا الگ الگ نام رکھا اور اصلین کتاب و سُنّت سے اس قدر بعد و ہجر ، اور مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ سے اس قدر شغف و وصل ہو گیا ، کہ اپنے ٹھہرائے ہوئے ناموں میں اس کے لیے بڑا ہی دُکھ اور بڑی ہی ذلت ہے ، حتیٰ کہ اگر اس طرف دعوت دی جاتی ہے تو اُسے کفر و ضلالت سے منسوب کرتی ہے ٹھیک یہودیوں کی حالت انھوں نے اپنے اُوپر طاری کر لی کہ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ زُبُرًا کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ

پس یہ اختلاف و شقاق ایک عذاب الٰہی ہے، مسلمانوں کی یہ سب سے بڑی معصیت ہے، سب سے بڑا طغیان ہے، سب سے بڑا عدوان ہے، اُن تمام مصائب و خسرانِ قومی کا مبدأ حقیقی ہے۔ زمین کی سطح پر مسلمانوں نے اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں کیا اور خدا نے جس قدر بھی اس وقت تک اُن کو سزائیں دی ہیں، وہ سب کی سب اسی بڑے جرم کی پاداش ہیں۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ وَأَنَّ اللّٰهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ (۸:۹۵)

اس اختلاف و تحزب کے علل و اسباب کیا کیا ہیں؟ اس کا علاج حقیقی کیا ہے؟ دائمی علاج اگر نہ ہو سکے تو عارضی علاج کی کیا صورت ہے؟ جس قدر علاج اب تک کیے گئے کیوں کامیاب نہیں ہوئے؟ ان پہلوؤں پر میں اس وقت نظر نہیں ڈالوں گا، کیونکہ مقصود صرف اپنے اصول دعوت و اصلاح کو واضح کرنا ہے، نہ کہ اصل مسئلہ پر نظر ڈالنا۔

عود الی المقصد

سطور مندرجہ صدر سے یہ چیز تمہارے سامنے واضح ہو گئی ہوگی کہ مسئلہ اختلاف و تفریق کے متعلق میرا عقیدہ کیا ہے، اور کس نظر سے اسے میں دیکھتا ہوں؟ اسی عقیدہ کا نتیجہ ہے کہ ہمیشہ اتحاد کلمہ کی دعوت میرے تمام کاروبار دعوت کی اولین بنیاد و اساس رہی ہے، اور کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ اپنی تحریر و تقریر کی کسی شاخ میں اس اصل مہم سے اعراض کر سکوں۔ ایک شخص فروعاتِ عمل میں ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن اپنے عقیدے اور اصل و کلیہ کو کبھی نہیں بھلا سکتا۔

الحمد للہ کہ گزشتہ چار سال کی متصل تحریر و اشاعت کی زندگی میں میں نے کبھی اصل جلیل و عظیم سے سرمو انحراف نہیں کیا، اور میری ان تمام تحریرات و

مطبوعات میں جو ہر آٹھویں دن دُنیا کے سامنے آشکارا ہو جاتی تھیں، ایک مضمون ایک سطر، ایک لفظ نہیں دکھلایا جا سکتا جس میں فریقانہ تعصبات اور فرقہ بندی کے ناپاک جذبات کا ایک شائبہ بھی پایا جاتا ہو، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

جو شخص اپنے عقائد محکمہ میں نفس اختلاف و شقاق ہی کو ایک ایسی ضلالت سمجھتا ہو جو کبھی اسلام کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی، اور جو شخص اسلام کی حقیقت کو "وحدت" اور کفر کا مفہوم "تفریق" یقین کرتا ہو، کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود تفریق و اختلاف کا موجب بنے، اور جس آگ کو بجھانے کے لیے اُٹھا ہے، اس کو اور زیادہ بھڑکائے؟

مَیں نے الحمدللہ کہ سُنی شیعہ کی تفریق سے فہم حقیقت کی ایک بالاتر جگہ پائی ہے، اور مَیں عزت پاکر پھر اُسے نہیں کھو دوں گا کہ فروتر جگہ اختیار کر دوں۔ راہ حقیقت طلبی میں میرا پہلا قدم وہی تھا جو ان تمام فریقانہ راہوں سے یک قلم الگ ہو کر ایک دوسری گم شدہ راہ کے سُراغ میں اُٹھا، اور صراطِ مُستقیم کو اپنے سامنے پایا جس کی نسبت اوّل دن ہی کہہ گیا تھا کہ:

فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ	اسلام کی اس ایک ہی صراط مستقیم کو اختیار کرو
فَتَفَرَّقَ بِكُمْ	بہت سی راہوں پر نہ چلو۔

مَیں نے ہمیشہ اتحاد کلمہ کی دعوت دی، ہمیشہ اختلاف و انشقاق کی تمام صداؤں سے مخالفت کی، ہمیشہ اُن لوگوں کو ملامت کی جو محض فریقانہ جذبات کی وجہ سے مسلمانوں کے حقوق پامال کرتے اور اُن کو اپنی اسلامی اخوت کا کوئی حصہ دینا نہیں چاہتے ہیں۔ میں نے کبھی سنیوں کی کسی بات کو محض اس لیے اچھا نہیں کہا کہ وہ سُنی ہیں، اور شیعوں کی سچائی سے اِس لیے انکار نہیں کیا کہ وہ شیعہ ہیں۔ حق و باطل کے مقام کی

طہارت جماعت بندی کی گندگی سے آلودہ نہیں ہو سکتی، اور یہ تقریبات اس شخص کے لیے کیا موثر ہو سکتی ہیں جو سرے سے اس تفریق کی زنجیر ہی کو توڑ چکا ہو؟ میں نہیں جانتا کہ سنیت کیا چیز ہے اور شیعیت کسے کہتے ہیں؟ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، اُس کی کتاب میرے پاس ہے، اور اشیاء کے حقائق ثابتہ کو تسلیم کرتا ہوں، پس جو چیز سفید ہے سفید ہے، جو سیاہ ہے سیاہ ہے، کوئی سفید کپڑا اس لیے سیاہ نہیں ہو سکتا کہ اس کو فلاں فرقہ نے پہنا اور کوئی حق اس لیے باطل نہیں ہو سکتا کہ یہ فلاں انسان کی طرف منسوب ہے۔

یہ ہیں میرے عقائد، یہ ہے میرا مسلک، اور یہ ہے وہ بصیرت راسخہ جو کتاب و سُنت نے مجھے عطا کی ہے، اسی بصیرت نے مجھ کو ہمیشہ فرقیانہ نزاعات سے الگ رکھا، اور وہی آج مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے ان عزیز و محترم بھائیوں کے آگے جنھوں نے اپنی مصلحت پر غیروں کے مقاصد کو ترجیح دی ہے، دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح، غیروں کی طرح نہیں بلکہ اپنوں کی طرح، بڑوں کے تحکم و غرور کے ساتھ نہیں بلکہ چھوٹوں کے عجز و نیاز کے ساتھ، مجوزہ شیعہ کالج کی طرز و اسلوب کار سے اپنا اختلاف پیش کروں: فَسَتَذْكُرُونَ مَآ اَقُولُ لَكُمْ وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(۲)

تحریک کی ابتداء

کسی مولود کی حالت کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز اس کے

مولد و منشاء کو معلوم کرنا ہے۔ اِس اعتبار سے مجوزہ شیعہ کالج کے لیے بھی سب سے پہلی بحث یہ سامنے آتی ہے کہ اس تحریک کا مبداء و مولد کیا ہے؟ بس کیا حالات و اسباب تھے جن سے اس تحریک کی تخلیق و تکوین ہوئی؟ اس کا مبداء خود انسان کے قلب کے اندر رہے، جہاں ضرورتوں کا احساس اور حقیقتوں کا علم ہوتا ہے، یا باہر کا اثر ہے جس نے اپنی مصلحتوں کے لیے دوسروں کی مصلحتوں کا نام اختیار کیا ہے؟ پھر جس فضا میں اس تحریک کے مخلوق صناعی نے پرورش پائی، وہ کہاں کی فضا، اور کس سرزمین کا موسم تھا؟ میدانی سرزمینیں تھیں جہاں بیج بویا جاتا ہے۔ یا پہاڑوں کی چوٹیاں تھیں جن کی بلندی سے پانی برستا ہے۔

اِس بارے میں دُنیا کی معلومات حسب ذیل ہیں؛

غالباً تین سال کا زمانہ گذرا کہ شیعہ کانفرنس کے بعض ارکان نے علی گڑھ کالج کے متعلق بعض تحریرات شائع کیں، اور اس مسئلہ کو چھیڑا کہ علی گڑھ کالج میں شیعوں کے حقوق بہ حیثیت شیعہ ہونے کے کیا کیا ہیں، اور ان کو کس طرح پامال کیا جا رہا ہے؟ ساتھ ہی اِس بارے میں ارکان کالج سے خط و کتابت بھی شروع کی، اور اپنے جماعتی مطالبات کی ایک فہرست پیش کی۔ سب سے پہلی مراسلت غالباً نواب وقار الملک کے عُہدۂ نظامت کے عہد میں ہوئی تھی۔

مطالبات کی فہرست میں نے اُس زمانے میں دیکھی تھی، مگر اس وقت اُن کی تمام جُزئیات یاد نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی اس فہرست کا یہ حال تھا کہ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَیِّئًا۔ بعض مطالبات تو واقعی مستحق قبول تھے اور بعض صحیح نہ تھے مثلاً شیعہ طلباء کے حقوق دینی اور اہتمام ضروریات دینیہ کے متعلق جو کچھ لکھا تھا، اصولاً سب

درست تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ مطالبہ بالکل بے معنی تھا کہ کالج کا سکریٹری سنّی ہو اور اس کے بعد دوسرا شیعہ۔ کالج کا سکریٹری یقیناً شیعہ ہونا چاہیئے اور اگر ہمیشہ شیعہ ہی ہوتا رہے تو اور بہتر۔ لیکن اس لیے کہ وہ مسلمان اور صاحبِ صلاحیت ہے، نہ اس لیے کہ وہ شیعہ ہے۔ کیونکہ سنیت اور شیعت، سب مصنوعی اور خود ساختہ اسماء ہیں؛ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ نام کی سچائی اِس کرۂ ارضی پر صرف ایک ہے، اور وہ اسلام ہے: هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ۔

مطالبات میں شیعہ طلباء کی دینی تعلیم و تربیت اور دینی اعمال کے حقوق کے متعلق جس قدر دفعات تھیں، اصولاً اُن کی صحت میں کچھ کلام نہیں۔ لیکن علی گڑھ کالج کی سرزمین میں سرے سے مذہب اور اسلام کی تعلیم و تربیت ہی کو کون پوچھتا ہے کہ سُنی اور شیعہ دینیات کی بحث کی نوبت آئے؟ اگر ارکان شیعہ کانفرنس کو اس کی شکایت تھی کہ ان کی مخصوص تعلیم دینیات کا کالج میں کوئی انتظام نہیں تو وہ مجھے بتلائیں کہ عام طور پر نفس مذہب و اسلام کی تربیت ہی کا وہاں کون سا انتظام ہے؟ جن ارکان کالج سے وہ شیعوں کے حقوق مانگ رہے تھے وہ پہلے اسلام کے مطالبہ سے تو عہدہ برآ ہو جائیں؟ محض مسلمانوں کو بہلانے کے لیے اور ان سے چندے وصول کرنے کے لیے تو اس بستی کا ہر فرد مذہب مذہب۔ قوم قوم پکارنے لگتا ہے، اور جب مسلمانوں کے سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اور مذہب کی تربیت کا دُکھ اس سے زیادہ اس دُنیا میں اور کسی کو نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کالج میں جا کر اُن کے اعمال کا تجسس کیا جائے، اور دیکھا جائے کہ طلباء کے سامنے کالج کے ٹرسٹیوں نے، کالج کے عہدہ داروں نے، کالج کے پروفیسروں نے، مذہب کا مذہب کے اتباع کا اور

مذہب کی عملی زندگی کا کونسا نمونہ پیش کیا ہے؟ اور اپنے علم و عمل میں مذہب کو کتنی اہمیت و وقعت دیتے ہیں؟ تو اس وقت کھل جائے گا کہ نمائش و تصنع کے ان پردوں کے پیچھے کیا چھپا ہے؟ اور کس طرح عملی الحاد کو مذہب اور کفر و ارباب کفر کی پرستش کو اسلام پرستی کا نام دیا جا رہا ہے۔ مذہب کے ان پرستاروں اور اسلام کے ان غمگساروں میں سے اکثر وہ ہیں جن کو پانچ وقت اللہ کے حضور جھکنے سے بھی شرم آتی ہے، با ایں ہمہ اُن کا دعویٰ ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے مصلح ہیں اور مسلمانوں میں بھی بہت سی فریب خوردہ روحیں ایسی ہیں، جو یقین کر لیتی ہیں کہ گھوڑے کے بالوں سے ریشمی چادر بنی جا سکتی ہے اور فسق و الحاد سے مسلمانوں کی اصلاح ہو سکتی ہے!

بہر حال مطالبات کیے گیے۔ اور اس بارے میں ارکان کالج سے مراسلت شروع ہوئی۔ نفس مطالبات کے اعتدال و عدم اعتدال کے متعلق تو میں نے اپنی رائے ظاہر کر دی، لیکن دوسرا اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان شکایتوں کا اصلی مبداء کیا تھا؟ وہ خود پیدا ہوئی تھیں یا پیدا کرائی گئی تھیں؟ ممکن ہے کہ شکایتوں کا بیج خود بخود زمین میں پڑ گیا ہو، لیکن اس میں تو کوئی شک نہیں کہ پانی اُسے باہر سے ملا۔ اور اگر بیج کو باہر سے پانی نہ ملے تو زمین کی اندرونی رطوبت اتنی نہیں ہوتی جو اُسے تناور درخت بنا دے۔

یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی تعلیم اور علی گڑھ کی مرکزیت و احاطہ اثر کے متعلق احکام و اوامر میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا تھا اور جو چیز کل تک سب سے زیادہ محبوب تھی کیونکہ سب سے زیادہ سر شتانہ خلقت اور سب سے زیادہ اطاعت شعارانہ خصائص کا اس کی نسبت یقین کیا جاتا تھا۔ وہی اب سب سے زیادہ مبغوض ہو گئی تھی، کیونکہ واقعات کی تبدیلی نے ثابت کر دیا تھا کہ طاقت اور مرکزیت پیدا کر کے یہی

سب سے اچھی چیز کسی وقت سب سے زیادہ مضر اور پُرخطر بھی ہو سکتی ہے۔ ساتھ ہی واقعاتِ عمومی کے تغیرات نے اس کی بھی ضرورت پیدا کر دی تھی کہ اگر تفریق و نزاع باہمی کی کوئی نئی بُنیاد پڑ جائے تو حال کے لیے سب سے بڑی مصلحت اور مستقبل کے لیے سب سے بڑی بشارت ہوگی۔

علی گڑھ کالج اور شیعہ جماعت کے حقوق کا مسئلہ اس غرض کے حصول کے لیے بہ یک کرشمہ درکار ہو گیا۔ ایک طرف علی گڑھ کی مرکزیت تعلیم کے احاطہ و اثر، اور وحدت جذبات و خصائص پر بھی اس سے پُورا اثر پڑتا تھا، دوسری طرف اتحاد عمومی کے لیے بھی اِس سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا کہ جَعَلُوا اَهْلَهَا شِيَعًا کی پوری پوری تعمیل تھی۔ پس جیسا کہ قاعدہ ہے اور جیسا کہ ہوا ہے۔ مخفی و زیر حجاب رہنے والی قوتیں آگے بڑھیں، اور اس مسئلہ کو پرورش کے لیے خاص طور پر اپنی گودوں میں اُٹھا لیا۔

رفتہ رفتہ یہ مسئلہ یہاں تک بڑھا کہ بعض شیعہ ارکان و سرپرستان کالج نے کالج اور کالج کی اعانت سے دست برداری کا ارادہ کر لیا۔ ہز ہائینس نواب رامپور نے تار کے ذریعے اپنی علیحدگی کی اطلاع دی، اور جب ایک وفد اُن کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اُنھوں نے مطالبات کی فہرست نکال کر پیش کر دی۔ اسی وقت یہ امر بالکل واضح ہو گیا تھا کہ کون سی قوتیں اِس مسئلہ کے اندر کام کر رہی ہیں۔

با ایں ہمہ اس وقت بھی میری یہی رائے تھی اور اب بھی یہی رائے ہے، کہ خود ارکان کالج نے بھی اس بارے میں سخت غلطی کی، اور وہ یقیناً اس بات کے لیے جواب دہ ہیں کہ باوجود علم و خبر داری کے ابتدا ہی میں انھوں نے اِس

فتنہ کو کیوں نہیں روکا۔ اُن کو چاہیئے تھا کہ وہ اِن تمام مطالبات کا جو اُن کے بھائیوں نے اُن کے آگے پیش کیے تھے، پُوری کُشادہ دلی کے ساتھ استقبال کرتے، اور اپنی قواعد پرستیوں اور حاکمانہ بے صبریوں کی جگہ خوشی خوشی کہہ دیتے کہ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں اس سے ہمیں انکار نہیں ہے۔ اگر بعض مطالبات ناقابل قبول تھے تو اُن سے انکار کر دیتے۔ لیکن جس قدر حصّہ قابل عمل و قبول تھا، اُس کے مان لینے میں ایک لمحہ کی بھی دیر نہ لگاتے

ارباب کالج نے سب سے پہلے غلطی یہ کی کہ مطالبات پیش کرنے والوں کے حق و اہمیت سے صاف صاف انکار کرنا شروع کر دیا۔ کبھی کہا کہ اس طرح شکایت کرنا اور جواب مانگنا بالکل ناقابل التفات ہے ہمارے ٹرسٹیوں میں شیعہ ممبر بھی موجود ہیں اور وہی سب کچھ ہیں اُن کے سوا نہ تو اور کوئی شیعوں کا وکیل ہے اور نہ کسی کو حق نیابت و ترجمانی حاصل ہے۔ کبھی کہا کہ ہم نے دینیات کی ایک کمیٹی بنا دی ہے اور دینیات کی نگرانی کے لیے فلاں فلاں شیعہ حضرات ملازم ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

حالانکہ یہ سب باتیں فتنہ کی تھیں۔ ایسی ہی غلطیوں سے چھوٹی چھوٹی باتیں اتنی اہم بن جاتی ہیں کہ اُن سے اغیار فائدہ اُٹھاتے ہیں اور تفریق کلمہ کا ایک بنا بنایا کھیل انہیں مل جاتا ہے۔ کالج والوں کو سمجھنا تھا کہ معاملہ دوسرا ہو گیا ہے، اور ایک نئے فتنہ کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اس وقت قانون کالج کا حوالہ دینا اور اپنے کانسٹی ٹیوشن کا راگ گانا بالکل لاحاصل ہے۔ کوشش صرف اس کی ہونی چاہیئے کہ فتنہ کو زیادہ بڑھنے نہ دیا جائے۔

پھر شکایتیں بھی کیا ہیں، اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ محض چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں۔ جن میں کچھ بھی دھرا نہیں ہے۔ اگر کوئی نئی کمیٹی بن گئی یا چند نئے آدمیوں کو لے لیا گیا، یا چند تعطیلیں بڑھا دی گئیں تو ان باتوں سے کالج کا کیا بگڑتا ہے، اور

بہرحال اپنے ہی عزیزوں، اپنے ہی بھائیوں اپنے ہی گھر کے ساتھیوں کو اس سے خوشی ملتی ہے یہ بہتر ہے کہ اِس سے غیروں کو خوشی ہے۔ اگر ایک بھائی غلطی کر رہا ہے تو تم غلطی مت کرو اور اُسے منالو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اپنوں سے روٹھ کر غیروں کی چوکھٹ پر چلا جائے۔ اور بڑی سے بڑی مصیبت اور بڑے سے بڑا دُکھ برداشت کیا جا سکتا ہے مگر یہ نہیں دیکھا جا سکتا کہ اپنوں کا سر ہو اور غیروں کی چوکھٹ۔

بہرحال اِس بارے میں ارکان کالج نے بھی غلطی کی اور فرصت کو اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا۔ یہاں تک کہ اِس مسئلہ نے دوسرے دَور میں قدم رکھا اور ایک علیحدہ شیعہ کالج بنانے کا خیال پیدا کیا گیا۔ صورتِ حال یوں قرار دی گئی کہ علی گڑھ کالج صرف سُنیوں کا کالج ہے، اِس لیے چاہیئے کہ شیعوں کا بھی ایک الگ کالج قائم ہو۔

ڈیپوٹیشن

رفتہ رفتہ تمام ابتدائی مراتب طے کیے گیے اور بالآخر مسئلہ اس حد تک پہنچ گیا کہ ۱۴ جنوری کو زیر ریاست ہز ہائینس نواب صاحب رام پور ایک ڈیپوٹیشن ہز آنر سر جیمس مسٹن کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایڈریس پیش کیا۔

ایڈریس کے جواب میں ہز آنر نے جس عدیم النظیر جوش و محبت کے ساتھ اِس تجویز کا خیر مقدم کیا، اور جس طرح گورنمنٹ کی اعانت و شرکت کے والہانہ و مخلصانہ وعدے کیے، ان کو پڑھ کر مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہُوا، کیونکہ تعجب غیر متوقع نتائج پر ہوتا ہے اور یہ چیز پہلے سے معلوم تھی

ایڈریس کے جواب پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس تجویز میں ہز آنر کے لیے کچھ ایسی محبوبیت و مطلوبیت ہے کہ بار بار اس کی تعریف کرتے ہیں، بار بار اعانت کا

وعدہ کرتے ہیں، بار بار کام کرنے والوں کو داد دیتے ہیں اور پھر بھی جی نہیں بھرتا اور یہی کہتا ہے کہ ایک بار اور کہہ دیجئے:

اعد ذکر نعمان لنا، ان ذکرہ
هو المسك ما کررته یتضوع

چنانچہ وہ آخر میں خود ہی فرماتے ہیں: "میں آپ سے تین بار کہہ چکا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ صوبے کی گورنمنٹ آپ کی اس تجویز کو قابل تحسین و آفریں سمجھتی ہے، اور اس کی تائید کرتی ہے، اور جب اِس کا وقت آئے گا تو حتی الامکان آپ کی امداد میں ہرگز کوتاہی نہ کرے گی۔ آپ پورا اطمینان رکھیں کہ میں اور میرے ماتحت عہدہ دار ہر طرح جہاں تک امکان میں ہے آپ کی اعانت کرنے پر آمادہ رہیں گے۔

انھوں نے ایک افسر اعلیٰ کی طرح صرف اپنی گورنمنٹ کی زیادہ سے زیادہ ممکن اعانت کا وعدہ ہی نہ کیا، بلکہ ایک سچے مربی اور سرپرست کی طرح کام کرنے کی تدبیریں اور اُن کے قیمتی نکتے بھی سمجھا دئے۔

شیعہ کالج کے لیے چالیس لاکھ کا سرمایہ تجویز کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ چالیس لاکھ کی رقم جلد جمع نہیں ہو سکتی اور اس لیے جلد کالج بھی نہیں بن سکتا مگر تاخیر کا یہ پہلو ہز آنر کو گوارا نہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ چالیس لاکھ کی فراہمی کا انتظار نہ کیجئے، اگر بارہ لاکھ بھی جمع ہو جائیں تو کام شروع کر دیجئے۔

"آپ پہلے اس کم تر رقم یعنی ۱۲ لاکھ کے فوراً جمع کرنے کا ارادہ کریں، اگر یہ رقم وصول کر لی جاوے گی تو میں اس کی ذمہ داری کر سکتا ہوں کہ گورنمنٹ آپ کی اعانت کرے گی اور اپنے حدِ امکان پوری مدد دے گی"

اِس سے بھی زیادہ بے خطا تدبیر یہ بتلائی کہ:

"اپنی جماعت کے بڑے بڑے زمینداروں کو آمادہ کیجئے۔ وہ اپنی سالانہ آمدنی کا جزو معقول سرمایہ تعمیر میں دیں اور اپنی سالانہ مال گذاری میں سے کوئی مقررہ رقم فی صدی کالج کے مستقل اخراجات کے لیے دینا منظور کریں۔ ہندوستان کے ہر حصّے سے اپنی جماعت کے اشخاص کو لکھنؤ میں بلائیے تاکہ بڑے جلسے میں شریک ہوں اور اُن سے درخواست کیجئے کہ وطن کی واپسی سے پہلے کالج کے قیام کا قابلِ اطمینان بندوبست کرتے جائیں۔"

ایڈریس کے اِس جواب کے پڑھنے کے ساتھ مندرجہ ذیل واقعات کو بھی پیشِ نظر رکھ لیجئے:

(۱) سندھ کے مُسلمانوں نے خود ہی اپنی تعلیم و ترقّی کے لیے ایک دائمی فنڈ قائم کرنا چاہا اور تجویز کی کہ ہر زمیندار فی صدی کے حساب سے ایک رقم اس میں داخل کرے۔ علی گڑھ کانفرنس نے اس کے متعلق بار بار رزولیوشن پاس کیے اور حکّام سے التجائیں کیں کہ خدارا اس میں مدد دیجئے، مگر چار سال ہو گئے، اب تک کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔

(۲) بمبئی میں ایک مسلمان نے آٹھ لاکھ روپئے گورنمنٹ کو دئے ہیں تاکہ مُسلمانوں کی تعلیم میں خرچ کیے جائیں۔ اگر گورنمنٹ عام اصول کے مطابق اتنی رقم خود بھی دے دے یا شیعہ کالج کی طرح کسی بڑی سرکاری زبان سے اس کے لیے چند الفاظ کہلوادے تو ایک عمدہ کالج کی بنیاد فوراً پڑ سکتی ہے مگر گورنمنٹ بمبئی نے ظاہر کیا ہے کہ جنگ کی وجہ سے سر دست روپیہ نکالنا مشکل ہے۔

(۳) بنگال میں ایک کالج کا مسئلہ سالہا سال سے درپیش ہے لیکن موجودہ حالات و موانع کی وجہ سے اِس میں برابر تاخیر ہو رہی ہے۔ متعدد بار کہا ہے کہ

جنگ کی وجہ سے سردست روپے کی فراہمی مشکل ہے

مجوزہ شیعہ کالج کی تولید اور نشو و نما کی یہ اجمالی سرگذشت تھی۔ اِس کے مطالعہ سے ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ اِس تحریک کا مبداء و مولد کیا ہے؟ اور سوال اصلی ایک نئے کالج کا اور برادران شیعہ کی خواہش کا ہے، یا ان مقاصد مخفیہ کا جن کے لیے اِس تحریک کو آلہ بنا دیا گیا ہے۔

الساکت عن الحق شیطان اخرس

ایک طرف تو اس تحریک کی تولید و نشو و نما کا یہ حال نظر آتا ہے دوسری طرف علی گڑھ کے ارکان اور کالج اور محافظین مسئلہ تعلیم جدید کا موجودہ رویہ ہے، اور ضروری ہے کہ چند کلمات اِس کی نسبت بھی کہے جائیں۔

علی گڑھ کالج اور علی گڑھ کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا موضوع مسلمانوں کی جدید تعلیم اور علی الخصوص اعلیٰ تعلیم ہے۔ ہمارا موضوع پالٹیکس نہیں ہے، پس پولٹیکل معاملات میں ہم سے کسی آزادانہ رویے کی خواہش کرنا ایک ایسی چیز کا مطالبہ ہے جو ہمارے دائرہ عمل ہی سے باہر ہے، البتہ تعلیم کے متعلق ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

اُنھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ایک خاص اصول وضع کیا ہے، اور ہمیشہ کہتے آئے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی حیات و ممات کا دار و مدار اسی اصول پر ہے۔ اِس اصول کو وہ "ایک قومی مرکز کے قیام تکمیل" کے نام سے پکارتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے صرف تعلیم ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تعلیم سے بھی زیادہ ایک "قومی مرکز" کے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک کہ ایک

ایسا مرکز موجود نہ ہوگا متفرق کوششیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں پھر اس کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ علی گڈھ کالج ہی مسلمانوں کا قومی مرکز ہے۔ اور اسی کے قیام و تکمیل پر مسلمانوں کی تمام حیات و ممات قومی کا دارومدار ہے۔

اُن کی اصلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو دُنیا بھر کی چیزوں کا مرکز ثابت کر دیں، لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو مجبوراً "تعلیمی مرکز" کے قرار دینے ہی پر اکتفا کر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ دین و دُنیا کا اور کوئی کام نہ کریں، صرف کالج ہی کو پوجیں اور صرف کالج ہی کو روپیہ دیں جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ اگر وہ ایسا نہ کریں گے اور کاموں میں لگ جائیں گے، تو مرکز قائم نہ ہوگا، اور مرکز نہ ہوا تو پھر قوم قوم نہیں۔

نیز ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بُت بنایا ہے، اور اس کا نام رکھا ہے "سر سید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بُت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتے کے کاموں میں مداخلت کرے، یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بُت بنایا ہے اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم "سر سید کی پالیسی" سے سرمو تجاوز نہیں کریں گے اور مسلمان صرف وہی ہے جو "سر سید کی پالیسی" پہ نہ صرف ایمان مجمل بلکہ ایمانِ مفصّل کا اقرار کرے۔

سر سید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ اُنھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس، اور نیز میرٹھ کانفرنس میں خاص رزولیوشن پیش کیے کہ جب تک مسلمان

اپنی تمام متفرق اور علیحدہ علیحدہ کوششوں کو ترک کر کے ایک مکمل تعلیمی مرکز نہیں بنا لیں گے اُن کی کشتی طوفانِ ہلاکت سے نہیں نکلے گی۔ چنانچہ انہوں نے اس رزدلیوشن کا نام "مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ رکھا" اور ہمیشہ دوسرے کالجوں، اسکولوں اور مُستقل تعلیمی کوششوں کی مخالفت کرتے رہے۔ حتیٰ کہ لکھنؤ کانفرنس میں ان کو اسی مسئلہ کے متعلق اِس قدر جوش آگیا کہ بہت سے لوگ اس کے متحمل نہ ہو سکے۔ مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے پھبتیاں اُڑائیں اور لوگ جلسے سے اُٹھ کر واپس چلے آئے۔

ان تمام امور کے علاوہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اتحاد وجمعیۃ کلمہ کا داعی قرار دیتے ہیں، اور اسی بنا پر شیعہ مطالبات کا ایک بڑا حصہ اِن لوگوں نے منظور نہیں کیا، کیونکہ اِس کے ماننے سے مسلمانوں میں تفریق بڑھتی۔

مجھ کو یہاں اِس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے یہ تمام مسائل وعقائد صحیح ہیں یا غلط؟ بحث صرف یہ ہے کہ ان کے مدعیانہ عقائد کا یہ حال ہے۔ پس اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجوزہ شیعہ کالج کا وجود ان کے ان عقائد مسلمہ اور اُن کے امام معصوم کے مذہب وملت کے لحاظ سے کیا حکم رکھتا ہے؟

کیا ایک علیحدہ کالج کا قائم کرنا اُن کے اُصول "مرکزیت" کے لیے پیغام ہلاکت نہیں ہے؟

کیا شیعہ کالج کے نام سے اُس کی دعوت دینا کلمۂ اتحاد کے لیے فتنۂ عظیم نہیں ہے؟

کیا علی گڑھ کالج کے اندر دو مسجدوں کا بنانا تفریق تھا، مگر "شیعہ کالج" کی بُنیاد رکھ کر آب دہوانے تفریق میں آیندہ نسلوں کو تیار کرنا تفریق نہیں ہے!

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ شیعہ کالج کی اصل بُنیاد علی گڑھ کالج ہی کی مخالفت سے

پڑی اور اس طرح علی گڈھ کالج کے احاطہ و اثر کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے؟

کیا اس کالج کا وجود "سرسید کی مسلمہ پالیسی" اور مسلک تمرکز و جمعیۃ فریقین کے لیے جس پر محمڈن کالج کی بُنیاد رکھی گئی تھی، سخت مہلک نہیں ہے؟

کیا ارکان کالج میں ہر شخص کا اعتقاد و علم راسخ نہیں ہے کہ یہ تحریک موجودہ عہد کی سب سے زیادہ مضر تحریک ہے، اور اس سے سخت نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا؟

اگر ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت تک اس کی مخالفت و اصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے لیے کیا کارروائی کی ہے؟ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا موضوع صرف مسئلہ تعلیم ہے، مسئلہ تعلیم قومی کی اس یکسر ہلاکت و بربادی کے لیے کون سی صدا بلند کی ہے؟ یہ کیا ہے کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکسر بہرا گونگا بن گیا ہے۔ جیسا کہ سرسید نے نہیں بلکہ صاحب شریعت نے کہا ہے کہ الساکت عن الحق شیطان اخرس اور یہ کون ہے جس نے تمام مصالحین قوم، ماہرین فلسفۂ تعلیم اور مجددین مائۃ حاضرہ کی زبانوں پر ایسے قُفل چڑھا دیے ہیں کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکلتی، اور سب پر ہلاکت کی چُپ اور موت کی خاموشی چھا گئی ہے؟ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَاءٍ وَّمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ

تمہارا مسلک مرکزیت اب کہاں فنا ہو گیا؟ تمہاری دعوتِ قومیت کس گوشے میں دفن کر دی گئی؟ تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جا رہی ہے، تم کہاں چھپ گئے ہو؟ تمہارے امام معصوم کا مذہب ذبح کیا جا رہا ہے، تم کیوں نہیں بولتے؟ تمہاری شریعت تعلیم مٹائی جا رہی ہے، تمہارے گلوں میں پھندے کیوں پڑ گئے ہیں؟ یا سبحان اللہ!

اگر ایک مسلم اللہ اور رسول کے نام کی دعوت دے تو اُس پر اپنی کانفرنس کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو، اور کہتے ہو کہ سب سے پہلے سرسید پر ایمان لانے کا اقرار کرلے اس کے بعد وُہ تقریر کرسکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اُس نے سرسید کی شریعت سے انحراف کیا، لیکن آج سرے سے علی گڑھ کالج کا اصولِ بُنیاد ہی منہدم کیا جارہا ہے اور سرسید کی شریعت مرکزیت کی دھجیاں اُڑ رہی ہیں مگر تُم سب پر نفاق کی موت طاری ہوگئی ہے، اور تم سب مُردوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے ہو؟

تم کہتے ہو کہ ہمارا دائرہ عمل قومی تعلیم ہے، سیاست نہیں ہے۔ اچھی بات ہے لیکن اب بتلاؤ کہ یہ جو کچھ ہے سیاست ہے یا تعلیم؟ اگر قومی تعلیم کا مسئلہ ہے تو تمہاری قومیت اور قومی تعلیم کی لن ترانیاں کہاں دفن ہوگئیں؟

تم بھلا ان سوالات کا جواب کیا دو گے، مَیں خود ہی حقیقت کو بے نقاب کردیتا ہوں تاکہ ہر انسان تمہاری اصلی صورت دیکھ لے، اور معلوم ہوجائے کہ حق سے تمہارا رشتہ کیا ہے؟ نہ تو تمہارے اعتقادات بدلے ہیں اور نہ ہی تمہارے مسلک پر کوئی موت طاری ہوئی ہے، بلکہ اصلی مصیبت یہ ہے کہ تمہارے دل پر موت چھا گئی ہے اور تمہارے ایمان نے تم کو چھوڑ دیا۔ اصل یہ ہے کہ تمہارے صوبے کا سب سے بڑا حاکم علانیہ شیعہ کالج کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے، اور کھلے بندوں اُس کی حمایت کررہا ہے۔ یہ دیکھ کر تمہارے ہوش و حواس غائب ہوگئے ہیں، اور مارے ڈر اور ہیبت کے تمہاری جان نکلی جارہی ہے۔ تم دیکھتے ہو مگر بول نہیں سکتے، تم کہتے ہو کہ ہم نے ذرا بھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ ہم دربارِ شاہی سے مردود ہوجائیں:
نَخْشٰی اَنْ تُصِیْبَنَا دَآئِرَۃٌ ؕ

یہ ہے تمہاری حق پرستی، یہ ہے تمہاری صداقت، یہ ہے تمہاری مدت العمر کے دعوؤں اور لن ترانیوں کی کائنات وحقیقت! آہ! ایک انسان کے ڈر نے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کر دی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے۔ جس کو تمہارا دل حق کہہ رہا ہے۔ اے سست ایمانو! تم انسان سے ڈرتے ہو۔ مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے اُڑ جاتا ہے:

عَلٰی خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَمَلَائِهِمْ اَنْ یَّفْتِنَهُمْ (۱۰-۸۲)

یہی وہ مقام ہے جہاں اگر تم میرے مقابلے میں بیدست وپا ہو جاتے ہو، اور تمام دُنیا دیکھ لیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اُس کے ساتھ ہے جو اعلان حق کی وجہ سے اپنی زندگی کو ہر وقت خطروں اور ہلاکتوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے پھر بھی اعلاء کلمۃ الحق سے باز نہیں رہ سکتا، یا اُن کے ساتھ ہے جو اپنی پنجاہ سالہ کمائی کو صرف ایک انسان کے وہمی خوف اور ہیبت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں تاراج کر رہے ہیں؟ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(۳)

نَصَحْتُ لَکُمْ وَلٰکِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِیْنَ

گذشتہ دو نمبروں میں ہم نے بلا اختصار اپنے وہ خیالات ظاہر کر دئیے ہیں جو مجوزہ شیعہ کالج کی تحریک اور اس کے نشو ونما کے اسباب وبواعث میں سے ہمارے پیش نظر ہیں۔ اب آخری سوال یہ سامنے آتا ہے کہ موجودہ حالت میں کیا کرنا چاہیے؟

ہم اس کا جواب نہایت اختصار سے دیں گے کیونکہ اِس ہفتہ کسی مفصل تحریر کی گنجائش رسالہ میں نہ نکل سکی۔

(۱) ہمارا عقیدہ یہ نہیں ہے مسلمان محمڈن کالج کے سوا اور کوئی کالج قائم نہ کریں۔ جس قدر کالج بھی کامل نظام اور صحیح نظام تربیت کے ساتھ قائم ہو سکیں، بہتر ہیں اور ضرور نہیں۔ "مرکز" اور "تعلیمی مرکز" کا خیال اصلاً غلط نہیں ہے مگر جو مطلب ارباب علی گڑھ نے سمجھا ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ دُنیا کی غلطیاں اس لیے غلط نہیں ہوتیں کہ ان میں صحت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سچ کو جھوٹ سے ممزوج و آلودہ کر کے دکھلایا جاتا ہے، اور مخلوط سچ، خالص جھوٹ سے کہیں زیادہ فتنہ پرداز ہے۔ یقیناً اصولِ مرکزیہ ایک قُدرتی اور صحیح ترین چیز ہے، کوئی کام ہو بغیر اس کے چارہ نہیں، اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ علی گڈھ کالج مسلمانانِ ہند کے لیے نئی تعلیم کے مرکز کی حیثیت پیدا کر چکا ہے۔ مگر ساتھ ہی اس کے یہ معنی بھی نہیں ہیں کہ اور کوئی مفید کام نہ کیا جائے اور صرف مرکز مرکز پکارتے رہنا مسلمانوں کی تمام روزافزوں ضرورتوں کو پورا کر دے گا۔ خوارج نے کہا تھا کہ "اِنِ الحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ"۔ اِس پر حضرت امیر علیہ السلام نے فرمایا: "کَلِمَۃُ حَقٍّ یُرِیۡدُ بِھَا الۡبَاطِلُ"۔ اُن کا یہ کہنا کلمۂ حق ہے، مگر مقصود باطل ہے۔ سو اصول مرکزیہ کا بھی یہی حال ہے۔

(۲) پس اس سے بڑھ کر خوشی کی اور کون سی بات ہو سکتی ہے کہ ایک نیا کالج سلمانوں کے لیے اور قائم ہو جائے، لیکن کالج قائم کرنے کے یہ معنی نہ تھے کہ باہمی اختلاف و نزاع کی زمین تیار کر کے اس پر غیروں کے ہاتھوں تخم ریزی کرائی جاتی۔ چاہیے یہ تھا کہ علی گڈھ کالج سے الگ ہو کر محض خدمت قومی اور جذبات صالحۂ اسلامیہ پر اس کی بُنیاد رکھی جاتی۔ اِس صورت میں یہ سوال صرف ایک نئے کالج کا سوال ہوتا اور کوئی راست باز انسان ایسا نہ ہوتا کہ اِس تحریک کی پُرجوش دل سے تائید نہ کرتا۔

مگراب یہ کالج کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ افتراقِ اُمت و انشقاقِ ملت کے فتنۂ خوابیدہ کے ایقاظ و ازدیاد کا (لاقدر اللہ)

(۳) لیکن بہرحال جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اور اب اس کے سوا کچھ چارۂ کار نہیں کہ ماضی کے اعادہ سے مایوس ہو کر صرف صورت موجودہ پر غور کیا جائے تو جہاں تک میں سوچتا ہوں گو فتنہ کروٹ لے چکا ہے مگر اب بھی اس کو سلایا جا سکتا ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ داعیانِ تحریک کے دلوں کو کھول دے اور وہ مسلمانوں کی تباہ حالیوں پر رحم کھائیں اور اس کے صدیوں کے زخموں کو اور زیادہ گہرا نہ کرنا چاہیں تو اب بھی کچھ نہ کچھ صورت اصلاح پیدا ہو سکتی ہے اور اس تحریک سے نقصان کی جگہ فائدہ کی اُمید بھی کی جا سکتی ہے۔

(۴) داعیانِ شیعہ کالج سے یہ نہیں چاہتا کہ وہ اس تحریک کو چھوڑ دیں، اور نہ اس کا آرزومند ہوں کہ اپنے طریق کار میں کوئی بڑی بنیادی تبدیلی کریں۔ بلکہ نہایت عاجزی اور کمال منت کے ساتھ صرف دو جزئی تبدیلیوں کا خواستگار ہوں جن سے نہ تو اُن کے مقصد اصلی میں (اگر وہ محض اشاعت تعلیم و خدمت ملت ہے) کوئی حرج واقع ہو سکتا ہے اور نہ اُن کی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ وہ جو کچھ چاہیں کریں اور جو چاہیں بنائیں مگر خدا کے لئے اس کا نام "شیعہ کالج" نہ رکھیں، کیونکہ ان انسانوں کے لیے جو قرآن نامی کتاب کے ماننے والے اور محمد بن عبداللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پیرو ہیں، اس زمین پر بجز "اسلام" کے اور کوئی نام نہیں ہے۔ اب تک اس بدعت سے خاکِ ہند محفوظ رہی ہے کہ سُنّی کالج، شیعہ کالج اور اہل حدیث کالج کے ناموں سے کالج قائم ہوئے ہوں۔ پس خدارا افتراق و انشقاق کی ہلاکتوں کا ایک نیا دروازہ نہ کھولیں۔

پھر قطع نظر اس کے دیکھنا یہ ہے کہ مجوزہ کالج کو "شیعہ کالج" کے نام سے موسوم کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس کے قیام سے مقصود مسلمانوں کے اس گروہ کی تعلیم و تربیت خصوصی ہے جو شیعہ کہلاتا ہے، اس سبب اس کا نام بھی شیعہ رکھا جائے۔ سو اگر یہی مقصد ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کو نام سے کیا علاقہ ہے اور اگر اس کا نام شیعہ کالج نہ رکھا جائے گا تو اس کے مقصد کو کتنا نقصان پہنچے گا؟ مقصد اصلی کا حصول اس پر موقوف ہے کہ عملاً زیادہ تر شیعہ افراد ہی اس میں تعلیم پائیں، انہی کی تعلیم دینیات کا اس میں خالصتاً انتظام کیا جائے، اور ان سب اصولی امور کو اس کے کانسٹی ٹیوشن میں داخل کر دیا جائے پس اگر اس کا نام شیعہ کالج نہ رکھا جائے، جب بھی حصولِ مقصد میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔

بزرگان شیعہ کانفرنس و حضرات مجلس منتظمہ کالج کو غور کرنا چاہیئے کہ اب تک ہندوستان میں کوئی کالج اور مدرسہ کسی خاص فرقہ کے نام کے ساتھ قائم نہیں ہوا ہے، اور نہ صرف تفریق و انشقاق اور تمذہب و تحزب کی جھیل کو بھرنے کی جگہ زیادہ وسیع کر رہے ہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ نام اور انتساب کے ایک نئے فتنے کی بنیاد رکھنے والے بن رہے ہیں، جو اب تک کسی کو نہیں سوجھا تھا۔ نئے نئے فتنوں کی راہیں کھولنے کے لیے حضرت امیر علیہ السلام نے جو کچھ فرمایا ہے خدارا اسے نہج البلاغت کے خطبہ نہروان میں دیکھ لیں۔

"مسلمانوں کا کوئی کام ہو اور خواہ کوئی فرقہ انجام دے، مسلمانوں ہی کا کام ہے، اور اس کا نام بجز اسلام اور انتساب اسلام کے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں حضرات ائمہ کرام علیہم السلام کی تصریحات مندرجہ اصول کافی وغیرہ سے ثابت کر چکے کے

لیے تیار ہوں کہ جس طرح سُنیوں کے لیے صرف اسلام ہی کا نام سچّا نام ہے، اِسی طرح برادران شیعہ کے لیے بھی اُس خدا کے قرار دئے ہوئے نام کے سوا اور کوئی نام شرعی نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی وجہ سے حضرات مجوزین کالج مدرسہ اسلامیہ وغیرہ ناموں سے اس کو موسوم کرنا نہیں چاہتے تو غیر کسی ایسے عام نام سے موسوم کردیں جس میں کسی طرح کی بھی نسبت نہ ہو، مثلاً دارالعلوم وغیرہ۔ اِس طرح وہ اپنے مقاصد میں سے کسی چیز کو بھی نہیں کھوئیں گے، مگر تمام مسلمانوں پر ایک عظیم الشان احسان وفضل کرنے کا ذریعہ ہوں گے۔ ایسا احسان جس سے بڑھ کر اور کوئی احسان نہیں ہو سکتا اور سوچیں تو ان کا احسان خود انہی کے وجود کے لیے ہے۔

دوسری عاجزانہ التماس یہ ہے کہ جس طرح انھوں نے اس کی تعلیم کا دروازہ قابل تحسین فیاضی کے ساتھ تمام مسلمانوں کے لیے کھُلا رکھا ہے، اسی طرح اعانت کرنے اور اس کی بناء میں شریک ہونے کا دروازہ بھی اپنے بھائیوں پر بند نہ کریں اور یہ تخصیص نہ رکھیں کہ صرف شیعوں ہی کا روپیہ اس کے لیے قبول کیا جائے گا۔ وہ خاص طور پر خود کوشش کریں، اور خاص طور پر برادران شیعہ ہی سے اعانت کے طالب ہوں۔ لیکن دروازہ عام طور پر کھُلا ہو، اور اگر غیر شیعہ مسلمان بھی اس کی خدمت کا شرف حاصل کرنا چاہیں تو اسے نامنظور نہ کریں۔ اِس طرح کرنے سے خاص مقاصد کا کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔ اگر انہوں نے زرِاعانت کی فہرست سب کے لیے کھُلی رکھی تو اس سے یہ نتیجہ کبھی بھی نہیں نکلتا کہ کل کو کوئی اُن پر دعویٰ کردے گا۔ جبکہ اس کی بُنیاد رکھنے والے وہی ہیں اور اصلاً اُن کا

مقصد یہی ہے کہ خاص طور پر برادران شیعہ کی تعلیم کا انتظام ہو تو پھر غیر شیعہ مسلمانوں کی شمولیت کسی طرح بھی اس میں خلل انداز نہیں ہو سکتی۔ اگر بقول ارکانِ شیعہ کانفرنس کے شیعہ ارباب فیض کا لاکھوں روپیہ محمڈن کالج علی گڈھ سے شیعہ حقوق کو حاصل نہ کرا سکا تو پھر چند غیر مسلمانوں کا تھوڑا سا روپیہ کیوں مجوزہ کالج کی خصوصیت و تصرف میں خلل ڈال سکے گا؟ مجھے شخصاً معلوم ہے کہ متعدد غیر شیعہ حضرات بصورت قبولیت اس کام میں شرکت کرنے کے لیے تیار ہیں، اور انھوں نے مجھ سے کہا ہے کہ ہمارے لیے یہ بڑے ہی فخر اور عزت کی بات ہو گی کہ اگر ہمارے عزیز بھائی ہمارے ناچیز ہدیوں کو قبول کر لیں، اور سب سے پہلے میں خود اس خوشی کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اندر نہایت بے چین جوش پاتا ہوں۔